پروفیسر ڈاکٹر سید محمد اکرم

اِقبالؒ اور احیائے علوم

''قرآن مجید اس طرح سے پڑھا کر کہ جیسے یہ خدا کی طرف سے تجھ پر نازل ہو رہا ہے۔'' شیخ نور محمد نے یہ الفاظ اپنے نوعمر فرزند محمد اقبال کو قرآن پڑھتے دیکھ کر کہے۔(۱) غور کیا جائے تو قرآن فہمی سے متعلق یہ ایک جملہ کئی دفتروں پر حاوی ہے۔ اقبال نے قرآن مجید اسی ہدایت کے مطابق پڑھا۔ وحی الٰہی کا پہلا لفظ ہی ''اقراء'' ہے، یعنی ''پڑھ''۔ قرآن مجید جب نازل ہوا تو اس کی روح پرور تعلیمات کے نتیجے میں جن کا بہترین اظہار نبی کریم صلی اللہ علیہ آلہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کی صورت میں ہوا، دنیا کی ایک نہایت پس ماندہ اور جاہل قوم قلیل مدت میں اعلیٰ اخلاقی اقدار کی حامل بن گئی۔ اس ضمن میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر اپنا احسان عظیم بیان کرتے ہوئے فرمایا: ﴿**لقد من اللّٰہ علی المومنین اذ بعث فیھم رسولاً من انفسھم یتلوا علیھم آیتہ ویزکیھم ویعلمھم الکتاب والحکمہ**﴾ ''یعنی اللہ تعالیٰ نے مومنوں پر احسان فرمایا کہ ان میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو ان پر اللہ کی آیات پڑھتا ہے اور انہیں پاک کرتا ہے اور انہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ (قرآن- ۳:۱۶۴) انہی تعلیمات کی تاثیر سے مسلمانوں کے دل و دماغ کی خوابیدہ صلاحیتوں میں ایک ہیجان پیدا ہوا۔ علم و عمل کی قوتیں بیدار ہوئیں۔ علوم و معارف کے شعبوں میں نئے نئے انکشافات ہوئے۔ حریّت و مساوات اور محبت و احترامِ انسانی پر مبنی ایک عظیم الشان مثالی معاشرہ معرض وجود میں آیا۔

بیسویں صدی کا آغاز عالم اسلام کے انتہائی زوال و انحطاط کا زمانہ تھا اور یہ علامہ اقبال کے فکر و عمل کے ظہور کا وقت تھا۔ انہوں نے ملت اسلامیہ کے فکری، سیاسی اور تمدنی انحطاط کے علل و اسباب کا بغور جائزہ لیا اور اس

نتیجے پر پہنچے کہ مسلمانوں کی عظمت وعروج کا سبب قرآنی احکام پر عمل تھا۔قرآن ایک زندہ کتاب ہے۔وہ علوم ومعارف کا خزانہ اور سرچشمہ حیات ہے۔اگر ملت اسلامیہ کے پیکرِ مردہ میں پھر قرآنی روح پھونکی جائے تو اس کی تجدید حیات ممکن ہے۔چنانچہ انہوں نے احیائے ملی کے لیے احیائے علوم دینی کو اپنا منتہائے مقصود بنایا۔ علوم دینی کے ساتھ ساتھ علومِ دانشی کو بھی حیاتِ ملّی کے لیے یکساں طور پر ضروری قرار دیا۔

اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے جو انسان کی مادی اور معنوی زندگی کی بقا اور اس کے ارتقا کا ضامن ہے۔ اس لیے تمام مفید اور نافع علوم دراصل اسلامی علوم میں شامل ہیں۔اقبال نے جن علوم کے احیاء کی طرف خاص توجہ دی ان میں علمِ خودی،علمِ تصوف،علمِ فلسفہ،علمِ اخلاق،علمِ تاریخ،علمِ فقہ،علمِ اقتصاد،علمِ سیاست،علمِ شعر اور وہ علوم وفنون شامل ہیں جنہیں ہم آج جدید علوم وفنون کے نام سے یاد کرتے ہیں۔اقبال کی اس تحریک احیائے علوم کے بارے میں سید عبداللہ رقم طراز ہیں:''مشرقی اور مغربی علوم (خصوصاً حکمت) پر ان کی نظر ناقدانہ تھی جس نے انہیں تجزیں کا پورا حق بھی دیا اور اس کا استعمال بھی انہوں نے نہایت مثبت، بلکہ جارحانہ انداز میں کیا۔ان کے افکار کو احیائی افکار کہنا چاہیے۔(۲)

خودی

علامہ اقبال کے افکار کا مرکزی نقطہ خودی ہے جسے ان کا فلسفہ حیات کہنا چاہیے۔لفظ خودی فارسی اور اردو ادب میں عموماً غرور،تکبر اور خودخواہی کے معنوں میں استعمال ہوتا تھا۔علامہ اقبال نے اسے اساس نفس یا تعیّن ذات کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔خودی کو 'انا' اور 'جوہر نور' سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔حضرت علامہ اقبال کے نزدیک انسانی خودی کا وجود حقیقت مطلق سے ظہور پذیر ہوا ہے۔اس کا اثبات واستحکام منفی قوتوں کے خلاف تصادم اور پیکار کا مقتضی ہے تاکہ باطل پر حق کا غلبہ ہو اور دنیا سے فتنہ وفساد، جہالت وعصبیّت اور ظلم وظلمت کا خاتمہ ہو۔خودی کے اظہار کے لیے خیر وشر کے مابین تصادم کی یہ کیفیت ہمیشہ قائم رہی ہے۔

موسیٰؑ و فرعون و شبیرؑ و یزید ایں دو قوت از حیات آید پدید (رموز بے خودی،ص ۱۱)

اور

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی (بانگ درا، ۲۳۳)

نفس انسانی یا خودی کی حقیقت کو درک کرنے کے لیے یہ آیت پیش نظر رکھنی چاہیے۔﴿**ولا تکونوا کالذین نسو الله فانسهم انفسهم**﴾ ''یعنی ایسے لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے خدا کو بھلا دیا اور وہ اپنے آپ ہی کو بھلا بیٹھے''۔(الحشر:۱۹)

خودی، شعور کا روشن نقطہ ہے جس سے تمام تخیلات و جذبات مستنیر ہوتے ہیں۔خودی عمل کی رو سے ظاہر مگر اپنی حقیقت کی رو سے مضمّر ہے۔اقبال کے نزدیک دنیا کی ہر قوم اس کی حقیقت کے ادراک کے لیے کوشاں رہی ہے۔''مشرق کی فلسفی مزاج قومیں زیادہ تر اس نتیجے کی طرف مائل ہوئیں کہ انسانی انا محض ایک فریبِ تخیل ہے اور اس پھندے کو گلے سے اتار دینے کا نام نجات ہے۔مغربی اقوام کا عملی مذاق ان کو ایسے نتائج کی طرف لے گیا جس کے لیے ان کی فطرت متقاضی تھی۔(۳)

علامہ اقبال نے فلسفہ خودی کی توضیح و تفسیر سے زندگی کی خوابیدہ قوتوں کو بیدار کرنے کی کوشش کی ہے تا کہ انسان اپنے وجود کی لامحدود صلاحیتوں کو پہچانے اور انہیں معرض عمل میں لائے۔زندگی فرصت عمل کا نام ہے۔لذت حیات خودی کی انفرادی حیثیت اور اس کے اثبات واستحکام اور توسیع سے وابستہ ہے۔بالفاظ دیگر زندگی قوت سے عبارت ہے اور مذہب قوت کے بغیر محض فلسفہ ہے۔(۴) حضرت علامہ اقبال نے خودی کی وضاحت پر مبنی ایک خط پروفیسر نکلسن کو لکھا جس کے مطالب حسب ذیل ہیں:

''حیات ایک انفرادی شے ہے۔اس کی سب سے اعلیٰ صورت خودی ہے جس کے حصول کے بعد فرد ایک مکمل اور قائم بالذات مرکز بن جاتا ہے...... وہ خدا سے جتنا دور ہوتا جاتا ہے اتنی ہی اس کی انفرادیت کم ہوتی جاتی ہے۔جو خدا سے قریب ترین نقطہ پر پہنچ جاتا ہے وہی مکمل ترین شخص ہے۔اس لیے نہیں کہ وہ بالآخر خدا میں جذب ہو جاتا ہے۔بلکہ اس کے برعکس وہ خدا کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے ہے۔خودی اپنے راستہ سے تمام مزاحمتوں کو دور کر کے مختار بن جاتی ہے۔خودی کچھ حد تک مختار اور کچھ تک مجبور ہے۔اسے اختیار کامل اس وقت حاصل ہوتا ہے جب وہ اس فردِ اعظم (خدا) تک پہنچ جاتی ہے جو مختار مطلق ہے۔مختصر یہ کہ اختیار پانے کے لیے

سعی پیہم کا نام حیات ہے۔

انسان کے اندر حیات کا مرکز خودی یا شخصیت ہے۔ شخصیت، کشمکش کی ایک کیفیت ہے..... ہر وہ شے جو اس کیفیتِ کشمکش کی بقا میں معاون ہوتی ہے ہمیں غیر فانی بنانے میں مددگار رہتی ہے۔ خودی کے اس تصور سے اقدار کا معیار قائم ہو جاتا ہے اور خیر و شر کا مسئلہ بھی حل ہو جاتا ہے۔ ہر وہ شے جو خودی کو مستحکم بناتی ہے خیر ہے، اور جو اسے ضعیف بناتی ہے، شر ہے۔ آرٹ، مذہب، اخلاق سب کو خودی کے معیار ہی سے جانچنا چاہیے۔

''خودی عشق سے مستحکم ہوتی ہے جس میں جذب کرنے اور تسخیر کرنے کی آرزو شامل ہے..... جس طرح عشق خودی کو مستحکم کرتا ہے اسی طرح سوال خودی کو ضعیف کرتا ہے۔ وہ سب کچھ ذاتی سعی کے بغیر حاصل ہو، سوال کے ذیل میں آجاتا ہے۔ ایک دولت مند شخص کا بیٹا جسے اپنے باپ کی دولت ورثہ میں ملے، سائل اور گدا ہے اسی طرح وہ بھی جو دوسروں کے خیالات کے مطابق سوچتا اور خیال کرتا ہو، سائل اور گدا ہے۔ پس خودی کے استحکام کے لیے ہمیں عشق حاصل کرنا چاہیے تاکہ انسان ہر شے کو مسخر کرے اور سوال (بے عملی) کی ہر صورت سے گریز کرے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ کم سے کم مسلمانوں کے لیے تو عمل کا بہترین نمونہ پیش کرتا ہے۔

خودی کی تربیت کے تین مراحل ہیں۔ اطاعت، ضبطِ نفس اور نیابت الٰہی۔ اطاعت ایک حد تک جبر ہے، لیکن اسی جبر سے انسان خدا کا مطیع اور فرماں بردار بن کر اختیار حاصل کر لیتا ہے۔

اقبال کا انسان کامل اطاعت الٰہی سے تربیت پاتا ہے اور اوصاف الٰہی سے متّصف ہوتا ہے۔ تربیت کا راستہ شریعت اسلامی کا راستہ ہے۔ نائب حق روئے زمین پر خلیفۃ اللہ ہوتا ہے، وہ خودی کی تکمیل کا آئینہ، مقصود انسانیت اور ذہنی و جسمانی اعتبار سے حیات کا شاہکار ہوتا ہے۔ قدرت کاملہ اور علم کامل اس میں بیک وقت جمع ہو جاتے ہیں۔ بنی نوع انسان کا اصل حاکم وہی ہے۔ اس کی سلطنت روئے زمین کی سلطنت ہے۔ (۵)

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں کارکشا کارساز

(بالِ جبریل، ۹۷)

اس سلسلے میں دوسرا راستہ جو بعض قوموں نے اختیار کیا، وہ نفیٔ خودی، ترکِ علائق اور ترک دنیا کا راستہ ہے۔ یہ رہبانیت ہے جس کا رواج افلاطونی افکار، عیسائی مذہب اور بدھ مت کی تعلیمات کے تحت ہوا۔ یہ اپنی ہستی کا انکار، پیکارِ حیات سے گریز اور اپنی شکست کا اعتراف ہے۔ بقولِ اقبال:

گریز کشمکش زندگی سے مردوں کی
اگر شکست نہیں ہے تو اور کیا ہے شکست!

(ضربِ کلیم، ۳۹)

تیسرا راستہ مادہ پرستی کا ہے یعنی کائنات کو اپنا مقصدِ حیات بنالیا جائے۔ اس راستے کو خصوصیت کے ساتھ مغربی اقوام نے اختیار کیا ہے۔ یہ روحانی اور اخلاقی اقدار سے محروم اور اس بنا پر عالم انسانی کے لیے خطرناک ہے۔ یہ نہ اسلام کا راستہ ہے اور نہ ہی عیسائیت کا۔ عصرِ حاضر میں علامہ اقبال نے اس کے خلاف سب سے زیادہ آواز بلند کی ہے۔ ان کے کلام کا ایک عظیم حصہ مغرب کی لادین تہذیب کے خلاف سخت ردِعمل پر مبنی ہے۔ مغربی تہذیب خودی کی نامسلمانی ہے جس کے بطن سے مسولینی اور ہٹلر جیسے تباہ کن انسان پیدا ہوتے ہیں۔

فلسفہ خودی کے ساتھ علامہ اقبال نے نظریہ بیخودی پیش کیا ہے۔ فرد جب تکمیلِ خودی کے بعد اپنا رابطہ ملت کے ساتھ استوار کرتا ہے اور اپنی صلاحیتوں اور قوتوں کو معاشرے کے سپرد کرتا ہے تو اقبال اسے بیخودی کا عمل کہتے ہیں۔ انہوں نے اس کیفیت کو ''خود شکنی'' کا نام بھی دیا ہے۔ (۶) ایک خط میں لکھتے ہیں: ''حقیقی اسلامی بیخودی میرے نزدیک اپنے ذاتی اور شخصی میلانات، رجحانات و تخیلات کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کے احکام کا پابند ہو جانا ہے۔'' (۷)

اعلیٰ اخلاق کے حامل افراد کے باہمی ربط وضبط سے ایک صحت مند معاشرہ تشکیل پاتا ہے۔فرد جب اپنی خدمات ملّت کے حوالے کرتا ہے تو اس کی زندگی ملّت کی زندگی کا جزو بن کر لامحدود ہو جاتی ہے۔فرد کی عظمت کا معیار، وہ ایثار ہے جو وہ ملّت کے لیے کرتا ہے۔ملّت اسلامی کے دو بنیادی رکن ہیں توحید و رسالت۔

رسالتِ محمد صلی اللہ علیہ والہ وسلم کا مقصد انسانوں میں حریّت، مساوات اور اخوت کا قیام ہے۔یہی وہ اصول ہیں جن پر ایک اعلیٰ ترقی یافتہ اور متوازن معاشرہ قائم ہوسکتا ہے۔توحید رسالت کی اساس پر قائم معاشرہ زمان ومکان کی حدود سے ماوراء ہے۔ملت اسلامی کا آئین قرآن مجید ہے، اس کے بغیر مسلمان کی زندگی ممکن نہیں:

گر تو می خواہی مسلمان زیستن
نیست ممکن جز بہ قرآن زیستن

(رموزِ بیخودی،۱۴۳)

قومی سیرت کا حسن اور استحکام آئین الٰہی کے اتباع سے ممکن ہے، ملّت کا مرکز کعبہ شریف ہے تاکہ ملت کے افراد میں مکمل یکجہتی پیدا ہو۔ملت کا نصب العین دنیا میں توحید کی نشر واشاعت ہے۔ملت کی توسیع، تسخیر کائنات کے عمل پر مبنی ہے۔اقبال کے نزدیک کافر اور مومن کی پہچان ان کا وہ رویہّ ہے جو وہ کائنات کے بارے میں رکھتے ہیں۔کافر کائنات میں کھو جاتا ہے اور مومن اخلاقی طور پر اس پر غلبہ و قوت حاصل کرتا ہے۔

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اُس میں ہیں آفاق!

(ضربِ کلیم،۲۴)

ملّت کی صحیح تشکیل اس وقت ہوتی ہے جب ملّت میں فرد کی طرح خودی کا احساس پیدا ہو۔اس احساس کی تخلیق کے لیے قومی روایات کا تحفظ وبقا ضروری ہے جس سے ملّت ماضی، حال اور مستقبل کے ساتھ اپنا تعلق قائم

کرتی ہے۔ اقبال کے نزدیک حضرت فاطمۃ الزہرا ملت اسلامیہ کی خواتین کے لیے سیرت کا مکمل نمونہ ہیں۔

اقبال نے جب نظریۂ خودی پیش کیا تو بعض صوفیانہ حلقوں کی طرف سے اس تصوّر کی سخت مخالفت کی گئی یہاں تک کہ اقبال کو کافر کہا گیا۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ معاشرہ جو خود فراموشی کی گہری نیند سویا ہوا تھا بیدار ہونے کے لیے تیار نہ تھا۔ چنانچہ اقبال نے کہا:

اقبال! یہاں نام نہ لے علمِ خودی کا
موزوں نہیں مکتب کے لیے ایسے مقالات

(ضربِ کلیم، ۲۲)

اقبال نے علم خودی کو اس قوت اور جامعیت کے ساتھ پیش کیا کہ تھوڑے ہی عرصے میں مشرق و مغرب میں اسے زندگی کی حقیقت کے طور پر تسلیم کیا گیا۔ ان کا یہی فلسفہ حیات مسلمانوں کی بیدار اور ان میں انقلابی روح کے ظہور کا باعث بنا جس کے نتیجے میں وہ ایک مستقل مملکت کے حصول میں کامیاب ہوئے۔ ڈاکٹر یوسف حسین خان رقم طراز ہیں: ''اقبال نے ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے ایک سیاسی مرکز قائم کرنے کا جو تصوّر پیش کیا اس سے بعد میں دور رس نتائج مرتب ہوئے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو اقبال کا یہ خیال کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی ایک علیحدہ مملکت ہونی چاہیے اس کی خودی کے فلسفے کے عین مطابق ہے۔(۸)

تصوّف/فلسفہ

تصوّف وہ علم ہے جس کے متعلق حضرت علاّمہ اقبال نے نظم و نثر میں اپنے ناقدانہ خیالات کا مفصّل اظہار کیا ہے۔ تصوّف صدیوں سے مسلمانوں میں غیر معمولی اہمیت اور احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا رہا ہے اور صوفی منش حلقے عموماً اسے دین کی اصل روح اور زندگی کا حقیقی نصب العین قرار دیتے رہے ہیں۔ اعلیٰ اسلامی ادب خصوصاً شعر کی رعنائی، صوفیانہ تخیلات کی لطافّت و ظرافّت کی مرہون منت ہے۔ ان شُعرا کے پیش نظر تصوف پر تنقید کا تصور کرنا بھی مشکل تھا لیکن علاّمہ اقبال نے جو خود ایک درویش مسلک گھرانے کے چشم و چراغ تھے اور کہتے

تھے: ''میرا فطری اور آبائی رجحان تصوّف کی طرف ہے۔'' تصوّف کی اصلاح اور ملّت کے احیاء کی خاطر اس پر بے دریغ تنقید کی۔ اقبال قرآن مجید کی ابدی حقیقت پر پختہ ایمان رکھتے تھے۔ کوئی نظریہ یا عقیدہ یا فلسفہ یا قانون یا کوئی ضابطۂ حیات جو قرآن مجید کی تعلیمات سے ذرہ برابر بھی مختلف ہوتا، وہ اسے نہایت جرأت کے ساتھ مسترد کر دیتے تھے۔ انہوں نے فلسفہ اور تصوّف کے ان تمام مسائل اور نظریات کو جو حریم اسلام میں بعض عقبی دروازوں سے داخل ہو گئے تھے ساقط الاعتبار قرار دیا۔

خلافت راشدہ کے بعد اسلام کا عظیم جمہوری نظام کافی حد تک قیصر و کسریٰ کے استبدادی نظام میں تبدیل ہو گیا۔ مختلف ممالک کی فتوحات سے جہاں بکثرت دولت ہاتھ آئی وہاں متعدد مفتوحہ اقوام کے گوناگوں نظریات بھی مسلمانوں کے دل و دماغ پر اثر انداز ہوئے۔ چنانچہ یونانی، مسیحی، مجوسی، اور ہندی افکار نے مسلمانوں کے ذہنوں کو متاثر کیا۔ افلاطون اور فلاطینوس کے افکار میں مسلمان حکماء اور صوفیۂ نے خصوصیت کے ساتھ دلچسپی کا اظہار کیا۔ بعض زاہدانہ طبائع نے جابر اور آمر حکمرانوں کے ظلم و ستم اور عیش و عشرت سے نفرت کے نتیجے میں خلوت و انزوا کو پسند کیا۔ عالمانہ طبیعتوں نے استدلال اور فلسفیانہ موشگافیوں میں اپنی دماغی صلاحیتیں صرف کیں۔ مجموعی طور ملّت بے عملی اور کاہلی کی طرف مائل ہو گئی۔ علامہ اقبال نے تصوف کے بعض مسائل پر اظہار خیال کرتے ہوئے تحریر کیا:

> ''ہندی اور ایرانی صوفیہ میں سے اکثر نے مسئلہ فنا کی تفسیر فلسفہ ویدانت اور بدھ مت کے زیر اثر کی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان اس وقت عملی اعتبار سے ناکارہ محض ہے۔ میرے عقیدے کی رو سے یہ تفسیر بغداد کی تباہی سے بھی زیادہ خطرناک تھی اور ایک معنی میں میری تمام تحریریں اسی تفسیر کے خلاف ایک قسم کی بغاوت ہیں۔''(۱) مسئلہ بقا کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میرے نزدیک بقا انسان کی بلند ترین آرزو اور ایسی متاع گراں مایہ ہے جس کے حصول پر انسان اپنی تمام قوتیں مرکوز کر دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں عمل کی تمام صور و اشکال مختلفہ کو جن میں تصادم اور پیکار بھی شامل ہے ضروری سمجھتا ہوں اور میرے نزدیک ان سے انسان کو زیادہ استحکام اور استقلال حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ اسی خیال کے پیش نظر میں نے سکون و جمود اور اس نوع کے تصوف کو جس کا دائرہ محض قیاس آرائیوں تک محدود ہو،

مردود قرار دیا ہے۔'' (۲) مزید لکھتے ہیں کہ: ''آج کا مسلمان یونانی نثر اور فارسی تصوف کی دھندلی وادیوں میں بلا مقصد گھومنے پھرنے کو ترجیح دیتا ہے جو ہمیں یہ سکھاتی ہے کہ ہم گرد و نواح کی ٹھوس حقیقت کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں۔'' (۳)

نو فلاطونیت کو، جس سے نظریہ وحدت الوجود کو فروغ ملا فلسفۂ افلاطون کی مسخ شدہ صورت قرار دیتے ہوئے رقم طراز ہیں: ''مسلمانوں میں یہ مذہب حران کے عیسائیوں کے تراجم سے پھیلا اور رفتہ رفتہ مذہب اسلام کا ایک جزو بن گیا۔ میرے نزدیک یہ تعلیم قطعاً غیر اسلامی ہے اور قرآن کریم کے فلسفے سے اسے کوئی تعلق نہیں۔'' (۴) انہوں نے تصوف کے مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا: ''تصوف سے اگر اخلاص فی العمل مراد ہے (اور اس کا یہی مفہوم قرون اولیٰ میں لیا جاتا تھا) تو کسی مسلمان کو اس پر اعتراض نہیں ہو سکتا۔ ہاں جب تصوّف، فلسفہ بننے کی کوشش کرتا ہے اور عجمی اثرات کی وجہ سے نظام عالم کے حقائق اور باری تعالیٰ کی ذات سے متعلق موشگافیاں کر کے کشفی نظریہ پیش کرتا ہے تو میری روح اس کے خلاف بغاوت کرتی ہے۔'' (۵) تصوف کے ادبیات کا وہ حصہ جو اخلاق و عمل سے تعلق رکھتا ہے۔ نہایت قابل قدر ہے..... فلسفے کا حصّہ محض بیکار ہے اور بعض صورتوں میں میرے خیال میں تعلیم قرآنی کے مخالف۔'' (۶)

علامہ اقبال کے نزدیک فلسفیانہ تصّوف جس کے نظریات نے مسلمانوں میں نفیٔ خودی اور ترکِ دنیا کا رجحان پیدا کیا افلاطون کے بے روح اور خود گریز فلسفے کا نتیجہ تھا۔ انہوں نے افلاطون پر سخت تنقید کرتے ہوئے کہا: ''اس کے نزدیک زندگی کے اسرار پردۂ موت میں پنہاں ہیں۔ وہ ایک گوسفند ہے جس کا ظہور انسانی لباس میں ہوا۔ اس کی عقل آسمانوں میں سرگرداں رہی اور دنیا اور اس کے ہنگاموں کو اس نے محض ایک افسانہ قرار دیا۔ ہستی کو نیستی تصور کیا۔ وہ ذوق عمل سے محروم ہونے کے سبب کشمکش حیات سے دور رہا۔'' (۷) ظاہر ہے ایسے نظریہ کی اساس پر کوئی تہذیب استوار نہیں ہو سکتی۔ زندگی کی اعلیٰ اقدار کی تخلیق کے لیے ذوق عمل ضروری ہے۔ حضرت علاّمہ نے فرمایا: ''مذہب کو فلسفہ نظری بنانے کی کوشش کرنا میری رائے میں بے سود محض، بلکہ لغو نمائیت و مہمل ہے۔ اس لیے کہ مذہب کا مقصود یہ نہیں کہ انسان بیٹھا ہوا زندگی کی حقیقت پر غور کیا کرے۔ بلکہ اس کی اصلی

غائیت ہے کہ زندگی کی سطح کو بتدریج بلند کرنے کے لیے ایک مربوط اور متناسب عمرانی نظام قائم کیا جائے۔''(۸)
''تاریخ فلسفہ کی کتابیں ہمیں یہ تو بتاتی ہیں کہ مختلف قوموں نے کیا سوچا، لیکن ان مختلف معاشرتی اور سیاسی اسباب وعوامل کے بارے میں ہمیں کوئی معلومات فراہم نہیں کرتیں۔''(۹)

فلسفہ و شعر کی اور حقیقت ہے کیا
حرف تمنا جسے کہہ نہ سکیں روبرو!

(بالِ جبریل،۹۴)

اقبال کے نزدیک فلسفہ مجبور ہے کہ مذہب کی قدر و قیمت کے باب میں اس کی مرکزی حیثیت کا اعتراف کرے۔ حضرت علاّمہ اقبال کے نزدیک: ''قرآن مجید کا زور ٹھوس حقائق پر ہے اور حکمت یونان کا حقائق کی بجائے نظریات پر۔ قرآن مجید کی روح فلسفہ یونان کے منافی ہے۔ قرآن مجید کا رجحان زیادہ تر اس طرف ہے کہ فکر کی بجائے عمل پر زور دیا جائے۔''(۱۰) یونانی فلسفہ نے مفکرین اسلام کے مطمعٔ نظر میں اگرچہ وسعت پیدا کر دی تھی، مگر بحیثیت مجموعی قرآن مجید میں ان کی بصیرت محدود ہو کر رہ گئی۔(۱۱)

اس ضمن میں شبلی نعمانی لکھتے ہیں:

> ''مسلمانوں نے جب فلسفہ یونانی کا ترجمہ کیا تو اس کے اس قدر گرویدہ ہو گئے کہ گویا اس کا ہر مسئلہ الہام الٰہی تھا۔ چنانچہ افلاطون اور ارسطو کا دل و دماغ مسلمانوں میں آج تک مافوق الفطرت خیال کیا جاتا ہے۔ ترجمہ کے بعد علمائے اسلام نے بطور خود فلسفہ میں تصنیفات کیں تو مسلمات اوّلیہ کی طرح تسلیم کرتے آئے۔ یعقوب کندی، فارابی، شیخ بوعلی سینا جو درحقیقت خود ارسطو اور افلاطون کے ہم پایہ تھے، ان میں سے کسی نے بھی ان مسائل پر چون و چرا نہیں کیا۔''(۱۲)

یہ غزالی تھے جنہوں نے یونانی فلسفے کے طلسماتی محل کو منہدم کیا اور اس کی پراسرار حیثیت ختم کر دی۔ انہوں نے علوم دینی کے احیاء کی کامیاب کوشش کی۔ اقبال لکھتے ہیں: ''غزالی پہلے شخص ہیں جنہوں نے فلسفے کا ایک

باضابطہ رد لکھا اور راسخ العقیدہ لوگوں پر عقلیت کا جو رعب چھا گیا تھا، اس کو کامل طور پر زائل کر دیا غزالی کی دعوت میں ایک پیغمبرانہ شان تھی۔''(۱۳)

تیرھویں صدی میں جب عالم اسلام پر چنگیز اور ہلاکو کے تباہ کن حملے ہوئے اور اسلامی معاشرہ جو فکری انتشار کا پہلے سے ہی شکار تھا، ذوق عمل سے یکسر محروم ہو گیا تو اس شکست خوردہ ماحول کے خلاف رومؔی ایک زبردست ردعمل کے طور پر اٹھا۔ اس نے قرآن کی روح پرور تعلیمات کے مطابق زندگی کو عمل، حرکت اور جہاد سے تعبیر کیا۔ ایک روشن اور بلند نصب العین کے حصول کے لیے دلوں میں تڑپ پیدا کی اور سخت کوشی کی تعلیم دی۔ عزت وعظمت کا درس دیا۔ یونانی حکمت کو بے معنی ثابت کیا اور ترک دنیا کو اسلام کے منافی قرار دیا اور کہا:

چند چند از حکمت یونانیاں
حکمت اسلامیاں را ہم بخواں
مصلحت در دین ماجنگ و شکوہ
مصلحت در دین عیسیٰ غار و کوہ

(مثنوی معنوی، ۶: ۴۹۴)

بیسویں صدی میں علاّمہ اقبال کو بھی رومی جیسے دور سے گزرنا پڑا۔ چنانچہ انہوں نے کہا: ''آج دنیا کو کسی رومی کی ضرورت ہے جو امید کی شمع جلائے اور زندگی کے لیے آتش شوق فروزاں کرے۔''(۱۴)

مغربی استعمار کی قوت اور مسلمانوں کی شکست خوردہ ذہنیت کے پیش نظر اقبال، رومی کی طرح اپنے ماحول کی اصلاح اور اس کے احیاء کے لیے اٹھے۔ انہوں نے مغربی تہذیب کو اخلاقی اقدار سب محروم ہونے کی بنا پر نہایت خطرناک قرار دیا، اور دوسری طرف اسلام کی حقّانیت کو ثابت کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ انہیں خود داری، خودشناسی اور خودانحصاری کا درس دیا۔ اپنے اس احیائی عمل کو رومی سے مشابہ قرار دیتے ہوئے کہا:

چو رومی در حرم دادم اذاں من
ازو آموختم اسرارِ جاں من
بہ دورِ فتنۂ عصرِ کہن او
بہ دورِ فتنۂ عصرِ رواں من

(ارمغانِ حجاز، ٥٦)

یعنی میں نے مسلمانوں کے احیاء کے لیے رومی کی طرح اسلام کے حقائق بیان کئے ہیں اور میں نے زندگی کے اسرار اسی سے سیکھے ہیں۔ فتنہ وفساد کے قدیم دور میں وہ پیدا ہوا اور فتنہ وفساد کے جدید دور میں قدرت نے مجھے پیدا کیا۔

اقبال نے جہاں رومی کے خالص اسلامی نظامِ فکر کو ملت کے احیاء اور استحکام کے لیے ایک قوت حیات قرار دیا ہے وہاں انہوں نے شیخ ابن العربی کے فلسفیانہ تصوف پر سخت تنقید کی اور مسئلہ وحدت الوجود کو جو فلسفہ نو فلاطونیت ہی کی شکل تھا اور ابن العربی اس کے انتھک مفسر تھے، مسترد کیا۔ اقبال نے رومی کے علاوہ حضرت علی ہجویری اور شیخ سرہندی کے عرفان کی ترویج کی جو شریعت اسلامیہ کے صحیح نفاذ کی ایک کامیاب کوشش ہے۔ جن محقّقین نے اقبال کے نظریہ انسانِ کامل کے متعلق نٹیشے کے افکار کے اثرات کی نشاندہی کی ہے، انہوں نے یا تو رومی کے حرکی نظریات کا مطالعہ نہیں کیا یا اسے سمجھا نہیں سکے۔

حضرت علاّمہ کے مندرجہ ذیل اشعار جو ایک فلسفہ زدہ سید زادے کے نام ہیں زیر بحث موضوع کی وضاحت کے لیے خاص اہمیت کے حامل ہیں:

تو اپنی خودی اگر نہ کھوتا زناریء برگساں نہ ہوتا
ہیگل کا صدف گہر سے خالی ہے اُس کا طلسم سب خیالی

آدم کو ثبات کی طلب ہے — دستورِ حیات کی طلب ہے
میں اصل کا خاص سومناتی — آبا مرے لاتی و مناتی
تو سیّدِ ہاشمی کی اولاد — میری کفِ خاک برہمن زاد
ہے فلسفہ میرے آب و گِل میں — پوشیدہ ہے ریشۂ ہائے دل میں
اقبال اگرچہ بے ہنر ہے — اس کی رگ رگ سے با خبر ہے
انجام خِرد ہے بے حضوری — ہے فلسفہ زندگی سے دوری!
افکار کے نغمہ ہائے بے صَوت — ہیں ذوقِ عمل کے واسطے موت!
دیں مسلکِ زندگی کی تقویم — دیں سرِّ محمدؐ و ابراہیمؑ
دل در سخنِ محمدیؐ بند — اے پور علیؓ ز بو علی چند (۱۵)

علم اخلاق

اخلاق وہ عظیم اور اساسی علم ہے جس سے شخصیت کی نشو ونما ہوتی ہے۔ علامہ اقبال نے اسلام کو ایک ضابطۂ حیات قرار دیا ہے جس کی اخلاقی اقدار کی وضاحت انہوں نے رموزِ بیخودی میں تفصیل سے کی ہے۔ حریّت، مساوات، عدل، صداقت، تقویٰ، رزق حلال، انسانی احترام، شجاعت اور عفو و درگزر اعلیٰ اخلاقی اقدار ہیں۔ یہی اقدار اسلامی معاشرے کا تشخّص ہیں۔ علامہ اقبال صرف اس نظریہ کو قبول کرتے ہیں جو زندگی کی اخلاقی بنیادوں کو مستحکم کرے۔ کوئی بھی تہذیب جو اخلاق کی اساس پر استوار نہ ہو کبھی قائم نہیں رہ سکتی۔ اس کی تعمیر میں تخریب مضمّر ہوتی ہے۔ انہوں نے مغربی تہذیب کو اخلاق سے عاری دیکھ کر ۱۹۰۷ء میں اس کی تباہی کی پیشگوئی مندرجہ ذیل الفاظ کی تھی جو سات سال بعد پہلی جنگ عظیم کی صورت میں صحیح ثابت ہوئی:

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی — جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپایدار ہوگا

اقبال آزادیء گفتار و کردار کو انسان کا بنیادی حق تصور کرتے ہیں۔ لیکن آزادی افکار میں بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔ انہوں نے کہا: ''ہم اس تحریک کو جو حریت اور آزادی کے نام پر عالم اسلام میں پھیل رہی ہے، دل سے خیر مقدم کرتے ہیں، لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ آزاد خیالی کی یہی تحریک اسلام کا نازک ترین لمحہ بھی ہے۔ آزاد خیالی کا رجحان بالعموم تفرقہ اور انتشار کی طرف ہوتا ہے۔''(۱)

آزادی کی تحریک قومیت اور نسلی رجحان کو فروغ دیتی ہے۔ جس کے نتیجے میں جماعتیں مختلف اخلاقی ضابطے وضع کر لیتی ہیں اور وحدت ملی کا شیرازہ بکھر جاتا ہے۔ یورپ میں اسی آزاد خیالی کے نتیجے میں مذہب معطل اور منتفی ہوا اور سیکولرزم کا دور دورہ شروع ہوا۔ اقبال نے فرمایا: ''ہم کچھ ویسے ہی حالات سے گزر رہے ہیں جن سے پروٹسنٹ، یورپ میں گزر رہے تھے۔ لہٰذا ہمیں چاہیے کہ ان نتائج کو فراموش نہ کریں جن سے لوتھر کی تحریک کے نتائج مرتب ہوئے تھے۔''(۲)

اقبال کے نزدیک اسلامی تہذیب وہ عملی طریقہ ہے جس سے شخصیت کی نشو ونما ہوتی ہے اور آدمی کو انسان بننا میسر آتا ہے۔ اخلاق سے عاری تہذیب کا رخ تباہی و بربادی کی طرف ہو جاتا ہے اور وہ فرد اور جماعت دونوں کو تباہ کر دیتی ہے۔ مغربی تہذیب پر اقبال کی تنقید کا بنیادی سبب یہ ہے کہ وہ لادین تہذیب ہونے کی بنا پر اخلاق سے محروم ہے۔ انہوں نے ۱۹۳۱ء کو لندن میں ایک بیان میں کہا: ''اہل یورپ کی سب سے بڑی غلطی یہ تھی کہ انہوں نے مذہب و حکومت کو علیحدہ علیحدہ کر دیا۔ اس طرح ان کی تہذیب اخلاق سے محروم ہو گئی اور اس کا رخ دہریانہ مادیت کی طرح پھر گیا۔ اقبال نے فرمایا: ''میں نوجوانوں کو نصیحت کرتا ہوں کہ وہ مادیت سے بچیں۔''(۳)

شخصیت کا استحکام اور ارتقاء ایک اخلاقی ضابطے کا محتاج ہے۔ اس بنا پر اقبال نے آزادی افکار کو ابلیس کی ایجاد قرار دیا۔(۴) انہوں نے مغربی تہذیب میں اخلاقی انحطاط و انتشار کا سبب بیان کرتے ہوئے کہا:

''خود لوتھر کو بھی اس امر کا احساس نہ تھا کہ جن مخصوص حالات کے ماتحت اس کی تحریک کا آغاز ہوا ہے اس کا نتیجہ

بالآخر یہ ہوگا کہ مسیح علیہ السلام کا عالمگیر نظام اخلاق نیست و نابود ہو جائے گا اور اس کی جگہ اخلاقیات و سیاسیات کے قومی نظامات آ جائیں گے۔ اس سے اہل مغرب بجا طور پر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ مذہب کا معاملہ ہر فرد کی اپنی ذات تک محدود ہے اور اسے دنیوی زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔'' (۵)

بدقسمتی سے مسلمان اپنے سیاسی انحطاط، اقتصادی بحران اور فکری افلاس کی بنا پر مغربی تہذیب کے زیر اثر مغرب زدہ ہو گئے۔ انہوں نے اپنی شکست خوردہ ذہنیت کے سبب اسلام کو بھی مسیحیت کے مترادف مذہب قرار دے لیا اور سیاسی ادارے سے اسے خارج یا معطل کر دیا۔ چنانچہ مذہب کی جگہ قومیت کے وطنی تصور نے لے لی جس سے امت واحدہ کا شیرازہ بکھر گیا۔ (۶)

علامہ اقبال نے زندگی بھر مسلمانوں کے دلوں سے مغربی تہذیب کے طلسماتی نقوش مٹانے کی کوشش کی تا کہ وہ اسلامی اخلاقیات سے بہرہ مند ہوں جس کی رو سے آدمیت کا مطلب احترام آدمی لیا جاتا ہے اور ساری مخلوق خدا کا کنبہ قرار پائی۔ (۷)

اقبال کے نزدیک اسلام ہی انسان کو اعلیٰ اخلاقی شعور دے سکتا ہے اور منتشر افراد کو ایک نصب العین کی صورت عطا کر سکتا ہے۔ کیونکہ ملت نصب العین کی وحدت سے معرض وجود میں آتی ہے۔ (۸) انہوں نے فرمایا:

''اسلام ہی کی بدولت مسلمانوں کے سینے ان جذبات و عواطف سے معمور ہوئے جن پر جماعتوں کی زندگی کا دارومدار ہے اور جن سے متفرق و منتشر افراد بتدریج متحد ہو کر ایک متمیز اور معین قوم کی صورت اختیار کر لیتے ہیں اور ان کے اندر ایک مخصوص اخلاقی شعور پیدا ہو جاتا ہے..... اسلامی تمدن کے اندر ایک مخصوص اخلاقی روح کارفرما ہے۔'' (۹) ان کے نزدیک: ''دین اسلام فرد اور جماعت کے لیے اخلاقی حدود متعین کرتا ہے جس سے ایک ترقی یافتہ تہذیب اور فلاحی معاشرہ ظہور پذیر ہوتا ہے۔ دین اسلام نفس انسانی اور اس کی مرکزی قوتوں کو فنا نہیں کرتا، بلکہ ان کے عمل کے لیے حدود متعین کرتا ہے۔ ان حدود کو متعین کرنے کا نام اصطلاحِ اسلام میں شریعت یا قانون الٰہی ہے۔'' (۱۰)

اسلام دنیوی معاملات کے باب میں نہایت ژرف نگاہ ہے، انسان میں بے نفسی اور دنیوی لذائذ و نعم کے

ایثار کا جذبہ بھی پیدا کرتا ہے اور حسن معاملت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ اپنے ہمسائیوں کے بارے میں اس قسم کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ یورپ اس گنج گراں مایہ سے محروم ہے اور یہ متاع اسے ہمارے ہی فیض صحبت سے حاصل ہوسکتی ہے۔(۱۱) اعلیٰ اخلاق کا بہترین مظہر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿انک لعلی خلق عظیم﴾ ''یعنی اے پیغمبر بیشک آپ عظیم اخلاق والے ہیں۔ نیز فرمایا: ﴿لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنہ﴾ ''تمہارے لیے رسول اللہ کی زندگی بہترین نمونہ ہے۔ آپ نے خود بھی فرمایا: ﴿بعثت لاتمم مکارم الاخلاق﴾ ''یعنی میں اعلیٰ اخلاق کی تکمیل کے لیے آیا ہوں''۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اسوہ حسنہ، عالم انسانی کے لیے بہترین عملی نمونہ ہے۔ اقبال کے نزدیک دین اسلام پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اتباع کا نام ہے۔

بہ مصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است!

(ارمغانِ حجاز)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت ساری دنیا کے سامنے ایک روشن آئینے کی طرح موجود ہے۔ اقبال اس ضمن میں رقم طراز ہیں: ''اسلام کا بانی نہایت واضح طور پر ہمارے سامنے موجود ہے۔ وہ صحیح طور سے ایک عظیم شخصیت ہیں اور خود کو نہایت آزادانہ طور سے بے حد گہری تنقید کے لئے پیش کر دیتے ہیں۔ وہ تاریخ کے ایک تابناک دن کی روشنی میں پیدا ہوئے۔ ہم ان کے افعال کے داخلی سوتے کو پورے طور پر سمجھ سکتے ہیں۔ ہم ان کے ذہن کو گہرے نفسیاتی تجزیے کی دھار پر رکھ سکتے ہیں۔''(۱۲) ڈاکٹر این میری شمل رقم طراز ہیں کہ: ''عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ کو خدا کا بیٹا بنالیا اور وہ اس طرح قابل تقلید نہ رہے۔ اس کے برعکس کروڑوں مسلمان پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ کا رسول اور اللہ کا بندہ کہتے ہیں۔ اس طرح پیغمبر اسلام کی سیرت دوسروں کے لیے نمونہ ہے۔''(۱۳)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خطبہ حجۃ الوداع حقوق انسانی کا پہلا جامع و کامل منشور ہے جس میں آپ

نے نسلی اور وطنی تعصّبات کے خاتمہ کا اعلان فرمایا۔ بندہ و آقا، عرب و عجم اور اسود و احمر کے امتیازات کو کالعدم قرار دیا۔ فرمایا کہ سب انسان آدم کو اولاد ہیں۔ تم میں اچھا وہ ہے جو اللہ سے ڈرنے والا ہے۔

وہ دانائے سُبل ختم الرُسل مولائے کل جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادی سینا
نگاہِ عشق و مستی میں وہی اول وہی آخر
وہی قرآن وہی فرقان وہی یٰسین وہی طاہا

(بالِ جبریل، ۳۹)

علامہ اقبال نے اپنے تمام کلام میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ اپنی گہری عقیدت اور غیر معمولی محبت کا اظہار کرتے ہوئے حضور کے اخلاقی محاسن کو بیان کیا ہے، تاکہ مسلمان حضور کے اخلاق کو اپنائیں اور اہل عالم کے لیے اخلاق کا اعلیٰ نمونہ پیش کریں۔ اقبال اپنی پہلی فارسی مثنوی اسرار خودی کے آغاز میں لکھتے ہیں:

''نبی کریم کی محبت سے دل قوت حاصل کرتا ہے۔ آپ معمولی چٹائی پر سوتے تھے لیکن آپ نے اپنی امت کو تخت کسریٰ پر بٹھایا۔ آپ نے استحصالی قوتوں کی نسلوں کو ختم کیا اور دنیا کو ایک نیا زندگی بخش آئین عطا فرمایا۔ آپ نے دین کی حکمت سے امت پر دنیا کے دروازے کھول دیئے۔ مادر گیتی نے آج تک آپ جیسا کسی کو پیدا نہ کیا۔ آپ نے امیر و فقیر کو یکساں حیثیت عطا فرمائی اور اپنے غلام کے ساتھ ایک دسترخوان پر بیٹھ کر کھانا کھایا۔ آزادی کا درس انسان کو آپ ہی نے دیا اور آپ ہی نے سرداروں جابروں اور کاہنوں سے انسان کو آزاد کیا۔'' (۱۴)

علم سیاست

علامہ اقبال تاریخ عالم کے وہ غیر معمولی مفکر ہیں جن کے نظریہ تمدن کی اساس پر ایک عظیم الشان مملکت معرض وجود میں آئی۔ ان کا نظریہ تمدن مکمل طور پر اسلام تھا جس کا مرکزی نقطہ عقیدہ توحید ہے۔ توحید کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کائنات کا واحد خالق اور مالک ہے۔ وہی قادر مطلق ہے، وہی عبادت اور اطاعت کے لائق ہے۔

حکومت صرف اسی کی ہے۔کوئی دوسرا اس کی حکومت میں شریک نہیں۔بقول اقبال:

سروری زیبا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتان آزری

(بانگِ درا،۲۷۴)

''اسلام بحیثیت ایک نظام سیاست کے اصول توحید کو انسانوں کی جذباتی اور ذہنی زندگی میں ایک زندہ عنصر بنانے کا عملی طریقہ ہے۔اس کا مطالبہ وفاداری خدا کے لیے ہے نہ کہ تخت وتاج کے لیے۔'' ڈاکٹر یوسف خان کے بقول: ''اقتدار کا یہ نظریہ جدید مملکت کے معاہدہ عمرانی کے نظریے سے بالکل مختلف ہے جس کی رو سے مشیت عامہ جو کثرت رائے سے متعین ہوتی ہے، مملکتی اقتدار کا منبع تصور کی جاتی ہے۔ یہ مشیت عامہ سیاہ وسفید کی مالک ہوتی ہے۔ وہ غیر اخلاقی افعال کو اخلاقی اور ناحق کو حق قرار دینے کی بھی اپنے آپ کو مجاز سمجھتی ہے۔''(۱) معاہدہ عمرانی کا یہ نظریہ روسو نے پیش کیا تھا۔انقلاب فرانس میں اس کی بڑی پذیرائی ہوئی پھر مغرب میں جدید جمہوری حکومت کا نظام اسی نظریے پر قائم کیا گیا جس میں مکیاولی کے تصوّرِ حکومت کے مطابق دین اور سیاست دو مختلف اداروں کی حیثیت رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ دین اپنی اداری حیثیت سے بھی معزول ہو گیا اور صرف قومیت کا وطنی تصور سیاسی نصب العین بن گیا۔

اقبال نظریہ توحید کی تفسیر بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں: ''اسلام کے نزدیک ذاتِ انسانی بجائے خود ایک وحدت ہے۔ وہ مادے اور روح کی کسی ناقابل اتحاد ثنویت کا قائل نہیں۔ مذہب اسلام کی رو سے خدا اور کائنات، کلیسا اور ریاست، روح اور مادہ ایک ہی کل کے مختلف اجزاء ہیں۔''(۲) مادے کی ساری کثرت روح کے ادراک ذات کا ایک میدان ہے اور اس لیے جو کچھ بھی ہے مقدس ہے۔کیا خوب فرمایا حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ: ''ہمارے لیے یہ ساری زمین مسجد ہے۔'' ترک وطن پرستوں نے ریاست اور کلیسا کی تفریق کا اصول مغربی سیاست کی تاریخ افکار سے اخذ کیا۔مسیحیت کی ابتدا کسی وحدت سیاسی یا مدنی کے طور پر نہیں ہوئی تھی۔ وہ ایک نظام رہبانیت تھا جو اس ناپاک دنیا میں ہی قائم ہوا جس کا امور مذہبی میں کوئی دخل نہیں تھا۔

رومی حکومت کے زیر فرمان جب کلیسا ریاست کا مذہب قرار پایا تو ریاست اور کلیسا نے دو حریف قوتوں کی شکل اختیار کر لی۔ اسلام میں یہ صورت حالات رونما ہو ہی نہیں سکتی، اس لیے کہ اسلام کا ظہور بطور ایک اجتماع مدنی کے ہوا۔'' (۳) اسلام اب بھی ایک زندہ قوت ہے جو ذہن انسانی کو، نسل و وطن کی قیود سے آزاد کر سکتی ہے جس کا یہ عقیدہ ہے کہ مذہب کو فرد اور ریاست دونوں کی زندگی میں غیر معمولی اہمیت حاصل ہے اور جسے یقین ہے کہ اسلام کی تقدیر خود اس کے ہاتھ میں ہے۔ اسے کسی دوسری تقدیر کے حوالے نہیں کیا جا سکتا۔ (۴) اقبال کسی طور پر بھی اسلام کی اجتماعی حیثیت کو ختم کر کے اسے فرد کی نجی حیثیت دینے کے قائل نہ تھے۔ انہوں نے کہا: کیا مذہب ایک نجی معاملہ ہے اور آپ بھی یہی چاہتے ہیں کہ ایک اخلاقی اور سیاسی نصب العین کی حیثیت سے اسلام کا کبھی وہی حشر ہو جو مغرب میں مسیحیت کا ہوا ہے۔ اسلام کا مذہبی نصب العین اس کے معاشرتی نصب العین سے جو خود اسی کا پیدا کردہ ہے الگ نہیں..... دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ اگر آپ نے ایک کو ترک کیا تو بالآخر دوسرے کا ترک کرنا بھی لازم آئے گا۔ اسلام بحیثیت مذہب دین و سیاست کا جامع ہے۔ یہاں تک کہ ایک پہلو کا دوسرے پہلو سے جدا کرنا حقائق اسلامیہ کا خون کرنا ہے۔ (۵)

اقبال مسلمانوں کے لیے سیاسی ضابطہ حیات کے طور پر اسلام کو ناگزیر قرار دیتے ہیں۔ اس سے یہ مطلب اخذ نہیں کرنا چاہیے کہ چونکہ وہ متعہد مسلمان ہیں اس لیے اسلام کے مبلغ، مفسّر اور مؤید ہیں، بلکہ ان کے نزدیک صرف اسلام ہی ایک ایسا نظام ہے جو تمام انسانوں میں ایک حقیقی وحدت تخلیق کر سکتا ہے۔

اسلام رنگ، نسل اور علاقائی تعصّبات کی مکمل نفی کرتا ہے۔ اس کے نزدیک عرب و عجم، اسود و احمر، بندہ و آقا سب برابر ہیں۔ ان اعلیٰ انسانی اصولوں کی بنا پر اقبال اسلام کے مقابلے میں کسی ضابطہ حیات کو مطلق کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ انہوں نے کہا: ''میرے نزدیک فاشزم، کمیونزم یا زمانہ حال کے اور ازم کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ میرے عقیدے کی رُو سے صرف اسلام ہی ایک حقیقت ہے جو بنی نوع انسان کے لیے ہر نقطہ نگاہ سے موجب نجات ہو سکتی ہے۔'' (۶) اسلام ہیئت اجتماعیہ انسانیہ کے اصول کی حیثیت میں کوئی لچک اپنے اندر نہیں رکھتا اور ہیئت اجتماعیہ کے کسی اور آئین سے کسی قسم کا راضی نامہ یا سمجھوتہ کرنے کے لیے تیار نہیں۔ بلکہ اس امر کا اعلان کرتا

ہے کہ ہر دستور العمل جو غیر اسلامی ہو وہ نامعقول اور مردود ہے۔

باطل دوئی پسند ہے، حق لا شریک ہے
شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول!

(ضربِ کلیم، ۸۷)

اقبال کے نزدیک اسلام ایک جمہوری نظام حیات ہے اور جمہوریہ اسلامیہ کی بنا شریعت حقہ کے نزدیک ایک مطلق اور آزاد مساوات پر قائم ہے۔ شریعت کے نزدیک کوئی گروہ، کوئی ملک، کوئی زمین فائق و مرجح نہیں۔ اسلام میں کوئی مذہبی پیشوائی یا مشیخیت نہیں۔ ذات پات یا نسل و وطن کا امتیاز نہیں۔ (۷) سب سے پہلے نبیِ عرب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انسان کو فطری آزادی کی تعلیم دی اور غلاموں اور آقاؤں کے حقوق کو مساوی قرار دے کر اس تمدنی انقلاب کی بنیاد رکھی جس کے نتائج کو اس وقت تمام دنیا محسوس کر رہی ہے۔ (۸)

اسلام ہر پہلو سے ایک متوازن نظام حیات ہے آخرت میں رحمت ہے اور دنیا میں بھی باعث برکت ہے۔ حضرت علاّمہ نے فرمایا: میرا مذہب ہے کہ اسلام نے دین و دنیا کے فرائض کو یک جا کر دیا ہے اور اس طرح بنی نوع انسان کے لیے ایک معتدل راہ قائم کی ہے۔ جہاں یہ سکھایا ہے کہ تمہارا مقصود، اعلائے کلمۃ اللہ ہے، وہاں یہ بھی تعلیم دی ہے کہ ﴿ولا تنس نصیبک من الدنیا﴾ ''دنیا میں اپنا حصہ فراموش نہ کر''۔ (۹) علامہ اقبال کے نزدیک عصر حاضر کے انسان کی مشکلات کو صرف اسلام ہی دور کر سکتا ہے کیونکہ: ''اسلام ہمیشہ رنگ و نسل کے عقیدے کا جو انسانیت کے نصب العین کی راہ میں سب سے بڑا سنگ گراں ہے نہایت کامیاب حریف رہا ہے۔ (۱۰)

پروفیسر نکلسن کے نام خط میں اسلام کو واحد جدید معاشرتی نظام قرار دیتے ہوئے لکھا: ''میری نظموں کا مقصود اسلام کی وکالت نہیں۔ بلکہ میری قوتِ طلب و جستجو تو صرف اس چیز پر مرکز و زر رہی ہے کہ ایک جدید معاشرتی نظام تلاش کیا جائے اور عقلاً ناممکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کوشش میں ایک ایسے معاشرتی نظام سے قطع نظر کر لیا جائے جس کا مقصد وحید ذات پات، رتبہ و درجہ، اور رنگ و نسل کے تمام امتیازات کو مٹا دینا ہے۔'' (۱۱)

اسلام عقائدی مذہب نہیں ہے۔ اس کا منتہائے مقصد یہ ہے کہ نوع انسانی ایک گھرانہ اور ایک خاندان بن جائے۔(۱۲) دنیا میں نسلی، لسّانی اور علاقائی تعصّبات ہی فتنہ وفساد کی اصل و اساس بنتے رہے ہیں۔ صرف دین اسلام ان کی نفی کرتا ہے۔ فرمایا: ''اسلام کے سوا اور کوئی ایسا طریق نہیں جس پر کاربند ہو کر یہ امتیازات مٹ سکیں۔ اسلام نے جو فرائض ارکان یا طریق عبادت مقرر کئے ہیں ان سب کا مدعا یہ ہے کہ انسانی قلوب کو رنگ، نسل اور قوم کے امتیازات سے پاک کر دے۔''(۱۳)

اقبال کے نزدیک اسلام کے علاوہ ہر نظام حیات ناقص اور بے معنی ہے۔ اسے مسترد کرنا چاہیے۔ قرآن کے مطابق دین صرف اسلام ہے جو ملت کو اس کے صحیح ثقافتی اور سیاسی معنوں میں سہارا دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم کھلم کھلا اعلان کرتا ہے کہ اسلام کے علاوہ کوئی نظام ہے تو اس کی مذمت کی جائے اور اسے مسترد کر دیا جائے۔(۱۴)

حضرت علامہ کو اسلامی حقائق کے بارے میں ایک غیر معمولی بصیرت حاصل تھی۔ اس بصیرت کی بنا پر وہ اسلام کو ایک حیات بخش عنصر قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں: ''دین اسلام غیر محسوس اور غیر مرئی حیاتیاتی، نفسیاتی سرگرمی ہے، جس میں یہ صلاحیت ودیعت کی گئی ہے کہ وہ بنی نوع انسان کے افکار و اعمال کو بغیر کسی کوشش کے متاثر کرتا ہے۔(۱۵)

اپنی ایمانی قوت کی بنا پر مزید کہتے ہیں: ''دنیا میں کارفرما قوتیں اکثر اسلام کے خلاف کام کر رہی ہیں۔ لیکن ''لیظھرہ علی الدین کلہ'' کے دعویٰ پر میرا ایمان ہے کہ انجام کار اسلام کی قوتیں کامیاب اور فائز ہوں گی۔''(۱۶)

اقبال کے سامنے برصغیر کے مسلمانوں کے جان و مال اور دین وثقافت کے تحفظ کا اہم مسئلہ تھا۔ یہ ان کی دور اندیش نگاہوں نے عصری حادثات کی روشنی میں درک کر لیا تھا کہ برصغیر سے انگریز کے چلے جانے کے بعد ہندو اکثریت مسلمان اقلیت کو اپنے اندر جذب کر کے ختم کر دے گی۔ حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے انہوں نے کہا:

''آئندہ نسلوں کی فکر کرنا ہمارا فرض ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ان کی زندگی گونڈ اور بھیل اقوام کی طرح ہو جائے اور

رفتہ رفتہ ان کا دین اور کلچر اس ملک میں فنا ہو جائے۔ اگر ان مقاصد کی تکمیل کے لیے مجھے تمام کام چھوڑنے پڑے تو انشاءاللہ چھوڑ دوں گا اور اپنی زندگی کے باقی ایام اس مقصدِ جلیل کے لیے وقف کر دوں گا۔ ہم لوگ قیامت کے روز خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے جواب دہ ہوں گے۔'' (۱۷)

علامہ اقبال ہندوستان کی ہزار سالہ سیاسی، مذہبی اور تمدنی تاریخ اور عصری خوفناک حالات اور واقعات کے تناظر میں اس نتیجے پر پہنچے کہ برصغیر مختلف اقوام کا ملک ہے ہندو اور مسلمان دو بڑی قومیں ہیں جو مذہبی اور تمدنی طور پر ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ نظریہ توحید نے اکبر اور کبیر کی ان کوششوں کو کامیاب نہیں ہونے دیا جو انہوں نے اسلامی تشخص کو ختم کرنے کے لیے کیں۔ دونوں قوموں میں ہمیشہ جنگ وجدال برقرار رہا ہے۔ انگریزوں کی جابرانہ حکومت کے باوجود دونوں قوموں میں خصومت کی آگ ہمیشہ بھڑکتی رہی اور خونریز تصادم ہوتے رہے۔ ہندو اکثریت نے مسلمانوں کے وجود کو کسی طرح برداشت نہیں کیا۔ اندریں احوال اس ملک میں امن وامان کے حل کا واحد طریقہ یہ ہے کہ مسلم اکثریت کے صوبوں کو علیحدہ کر کے ایک مستقل اسلامی ریاست قائم کی جائے۔ چنانچہ انہوں نے ۱۹۳۰ء میں مسلم لیگ کے صدارتی خطبہ میں واضح طور پر کہا: ''میری خواہش ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ایک ہی ریاست میں ملا دیا جائے۔ خواہ یہ ریاست سلطنت برطانیہ کے اندر حکومت خود اختیاری حاصل کرے خواہ اس کے باہر، مجھے تو ایسا نظر آتا ہے اور نہیں تو شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کو آخر ایک منظّم اسلامی ریاست قائم کرنی پڑے گی۔'' (۱۸) تاکہ اسلام بحیثیت ایک تمدنی قوت کے زندہ رہے۔

حضرت علامہ کے تصوّر کے مطابق پاکستان ایک آزاد اسلامی ریاست کی صورت میں ظہور پذیر ہوا۔ مؤسس پاکستان حضرت قائداعظم نے علامہ اقبال کی سیاسی بصیرت کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے فرمایا: ''اس حقیقت کو میں سمجھتا ہوں کہ وہ ایک بہت بڑے سیاست دان بھی تھے۔ انہوں نے آپ کے سامنے ایک واضح اور صحیح راستہ رکھ دیا جس سے بہتر کوئی دوسرا راستہ نہیں ہوسکتا۔ مرحوم دور حاضر میں اسلام کے بہترین شارح تھے کیونکہ اس زمانے میں اقبال سے بہتر اسلام کو کسی نے نہیں سمجھا۔ مجھے اس امر کا فخر حاصل ہے کہ ان کی قیادت

میں ایک سپاہی کی حیثیت سے کام کرنے کا مجھے موقع مل چکا ہے۔ میں نے ان سے زیادہ وفادار رفیق اور اسلام کا شیدائی نہیں دیکھا۔'' (۱۹)

علم فقہ/ قانون

تیرھویں صدی عیسوی میں عالم اسلام پر وحشی منگولوں کے حملوں کے نتیجے میں بڑے بڑے مراکز جن میں بغداد بھی شامل تھا تباہ ہونے سے اکثر دینی و علمی ادارے معطل اور منتشر ہو گئے۔ اسلامی قانون سازی کا دروازہ بھی اس خدشے کے پیش نظر بند کر دیا گیا کہ مبادا ملت میں علما کے فقہی اختلافات سے مزید افتراق و انتشار پیدا ہو۔ اس خیال کے پیش نظر علامہ اقبال نے اجتہاد پر خصوصیت کے ساتھ اظہار خیال کیا۔ انہوں نے ۱۹۱۸ء میں شائع ہونے والی اپنی کتاب رموزِ بیخودی میں اجتہاد کے بارے میں لکھا کہ زمانۂ انحطاط میں فقہائے سلف کی تقلید اجتہاد سے بہتر ہے، مبادا عالمان کم نظر کے اجتہاد سے مزید مشکلات پیدا ہوں۔

ز اجتہاد عالمانِ کم نظر

اقتدا بر رفتگاں محفوظ تر

(رموزِ بیخودی، ۱۳۵)

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ بعض عالمی حالات نے حضرت علامہ کو مسلمانوں کے لیے ایک نئی زندگی کی امید دلائی اور طلوع اسلام کا ایک نیا افق دکھایا۔ انہوں نے اپنی کتاب ''پیام مشرق'' کے دیباچہ میں لکھا کہ: ''یورپ کی جنگ عظیم ایک قیامت تھی جس نے پرانی دنیا کے نظام کو تقریباً ہر پہلو سے فنا کر دیا ہے اور اب تمدن کی خاکستر سے فطرت زندگی کی گہرائیوں میں ایک نیا آدم اور اس کے رہنے کے لیے ایک نئی دنیا تعمیر کر رہی ہے۔ (۱)

۱۹۱۷ء میں روس کا اشتراکی انقلاب اور ۱۹۲۲ء میں ترکی میں گرینڈ نیشنل اسمبلی کی تشکیل، سائنسی ایجادات اور جنگ عظیم کے بعد استعمار کی گرفت کی کمزوری نے اقبال کے فکر و نظر کو ایک نئی جہت دی۔ اب ان کے ذہن میں برصغیر میں ایک آزاد اسلامی ریاست کا وجود اور اس کے لیے اسلامی قانونی کی تدوین نو کا تصور ایک حقیقت

بن گیا۔ چنانچہ انہوں نے فقہ کی تجدید اور ضرورت پر اپنے خیالات کا مفصل اظہار کیا اور فرمایا:

''ہمارا فرض ہے کہ ماضی سے اپنا رشتہ منقطع کئے بغیر اسلام پر بحیثیت ایک نظام فکر از سر نو غور کریں۔''(۲)

فقہی نظام کی تجدید اقبال کے نزدیک یوں بھی ضروری تھی کہ بہت سے غیر اسلامی نظریات اور توہمات مسلمانوں میں رائج ہو گئے تھے جنہیں دور کرنے کی ضرورت تھی۔ انہوں نے کہا: ''اسلام کے اخلاقی اور اجتماعی مقاصد بعض توہمات کے زیر اثر جو امم اسلامیہ کے اندر زمانہ قبل از اسلام سے کام کر رہے تھے، غیر اسلامی شکل اختیار کرتے چلے گئے۔ یہ اسلامی کم اور عجمی، عربی اور ترکی زیادہ ہیں.....اب کوئی چارۂ کار ہے تو یہ کہ ہم اس قشر کو جو سختی سے اسلام کے ساتھ جم گیا ہے اور اس نے زندگی کے متحرک نظریے کو جامد کر دیا ہے، توڑ ڈالیں اور یوں حریت، مساوات اور استحکام انسانیت کی ابدی صداقتوں کو پھر سے دریافت کرتے ہوئے سیاسی، اخلاقی اور اجتماعی مقاصد کی از سر نو تعمیر کریں۔(۳)

اقبال کے نزدیک زندگی دائمی حرکت اور پیہم تغیر سے عبارت ہے، اس کے تخلیقی عمل سے معاشرہ کو دور نہیں رکھا جا سکتا۔ انہوں نے کہا: ''آئمہ مذاہب نے ہرگز یہ دعویٰ نہیں کیا تھا کہ ان کے استدلال اور تعبیرات حرف آخر ہیں۔ اس لیے مسلمانوں کا آزاد خیال طبقہ اگر اس امر کا دعوے دار ہے کہ اسے اپنے تجربات کے پیش نظر فقہ و قانون کے بنیادی اصولوں کی از سر نو تعبیر کرنے کا حق ہے تو میرے نزدیک یہ کوئی غلط بات نہیں۔ قرآن مجید کا یہ ارشاد کہ زندگی ایک مسلسل تخلیقی عمل ہے بجائے خود اس امر کا مقتضی ہے کہ مسلمانوں کی ہر نسل اسلاف کی رہنمائی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے مسائل آپ حل کرے۔(۴) ''لوگ تو بدل رہے ہیں لیکن قانون جہاں تھا وہی کھڑا ہے۔''(۵) اقبال فقہ اسلامی کی تدوین نو میں اسلاف سے رہنمائی کی ضرورت کو محسوس کرتے ہیں لیکن وہ عصری تقاضوں کے پیش نظر اس عمل کی انجام دہی میں اسلاف سے اختلاف کرنے کے لیے بھی تیار ہیں۔ انہوں نے کہا:

''اب ہمارے سامنے کوئی رستہ ہے تو یہ کہ علم حاضر کے احترام اور قدر و منزلت کے باوجود ہم اپنی آزادی رائے برقرار رکھتے ہوئے یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ اسلامی تعلیمات کی تعبیر اب علم حاضر کے پیش نظر کس رنگ میں کرنی

چاہیے۔خواہ ایسا کرنے میں اپنے اسلاف سے اختلاف ہی کرنا پڑے۔''(۶)

اسلاف سے اختلاف کی جرأت کے لیے جواز پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں: ''اس ساری جامعیت اور ہمہ گیری کے باوجود ہمارے نظاماتِ فقہ بالآخر افراد ہی کی ذاتی تعبیرات کا نتیجہ ہیں۔اس لیے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان پر قانون کے نشوونما کا خاتمہ ہو چکا ہے''۔''آئمہ مذاہب کا کیا یہی دعویٰ تھا کہ ان کے استدلالات اور تعبیرات حرف آخر ہیں، ہرگز نہیں۔''(۷)

اسلاف نے فقہی کوششیں قرآن، حدیث، اجماع اور قیاس کے حوالوں سے اپنے اپنے زمانے اور ماحول کے تقاضوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے انجام دیں۔لہٰذا ضرورت کے مطابق اس عمل کو جاری رہنا چاہیے۔یہ کہنا کہ اجتہاد کا دروازہ بند ہو چکا ہے محض ایک افسانہ ہے۔اقبال کے نزدیک یہ خیال دو وجوہ کی بنا پر پیدا ہوا۔ایک تو یہ کہ فقہی افکار مخصوص اور معین صورت اختیار کر گئے اور دوسرے لوگوں کے ذہنی تساہل کی وجہ سے حرکت نہ رہی۔ حضرت علامہ کے نزدیک مسلمانوں کی اس ذہنی حرکت کو روکنے میں اس ملوکانہ رویے کا ہاتھ ہے جو خلافت راشدہ کے بعد مسلمانوں میں پیدا ہوا۔انہوں نے فرمایا:

> ''خلیفہ چہارم کے بعد جب اسلام میں مطلق العنان ملوکیت نے سر اٹھایا تو یہ اس کے مفاد کے خلاف تھا کہ اجماع کو ایک مستقل یعنی ادارے کی شکل دی جاتی۔اموی اور عباسی خلفا کا فائدہ اسی میں تھا کہ اجتہاد کا حق بحیثیت افراد مجتہدین کے ہاتھ میں رہے۔اس کی بجائے کہ اس کے لیے ایک مستقل مجلس قائم ہو جو بہت ممکن ہے انجام کار ان سے بھی زیادہ طاقت حاصل کر لیتی۔''(۸)

مذکورہ سیاسی خاندانوں کے جبر استبداد ہی سے نہایت حساس دل و دماغ والے افراد تصوف کی طرف مائل ہو گئے۔اقبال رقم طراز ہیں: ''مسلمانوں کے بہترین دل و دماغ تصوف میں جذب ہو گئے اور اسلامی ریاست کی باگ ڈور متوسط درجے کے افراد یا بے علم عوام کے ہاتھوں میں آ گئی۔چنانچہ لوگ مذہب فقہ کی اندھا دھند تقلید کرتے چلے گئے۔''(۹)

جدید دور جمہوریت کی طرف بڑھ رہا ہے اور بلا شبہ جمہوری طرز حکومت اسلام کی روح کے عین مطابق

ہے۔ چنانچہ اس دور میں ہر شخص اپنا حق طلب کرتا ہے۔ اور بقول اقبال: ''عصر حاضر کا آزاد مسلمان یہ گوارا نہیں کرے گا کہ وہ اپنی آزادی ذہن کو خود اپنے ہاتھ سے دے دے۔'' (۱۰)

اقبال کے نقطہ نظر کے مطابق اجتہاد کا حق مختلف افراد کی بجائے قانون ساز مجلس کے پاس ہونا چاہیے، اس سے مختلف فرقوں میں اتفاق رائے بھی پیدا ہوگا اور علما کے علاوہ معاشرتی مسائل کی بصیرت رکھنے والے دانشور بھی اپنی رائے کا اظہار کر سکیں گے۔ اس ضمن میں وہ رقم طراز ہیں:

> ''بلاد اسلامیہ میں جمہوری روح کا نشو ونما اور قانون ساز مجلس کا یہ تدریجی قیام ایک بڑا ترقی اقدم ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مذہب اربعہ کے نمائندے جو سردست فراداً فرداً اجتہاد کا حق رکھتے ہیں، اپنا یہ حق قانون ساز مجلس کو منتقل کر دیں گے۔ یوں بھی مسلمان چونکہ متعدد فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں اس لیے ممکن ہے تو اس وقت اجماع کی یہی شکل۔ مزید برآں غیر علماء بھی جو، ان امور میں بڑی گہری نظر رکھتے ہیں اس میں حصہ لے سکیں گے۔ انہوں نے فرمایا: ''میرے نزدیک یہی ایک طریقہ ہے جس سے کام لے کر ہم زندگی کی اس روح کو جو ہمارے نظامات فقہ میں خوابیدہ ہے از سر نو بیدار کر سکتے ہیں۔'' (۱۱)

علم تاریخ

ایک اہم علم جس کے احیاء کی طرف اقبال کی توجہ خاص طور پر مبذول رہی، علم تاریخ ہے۔ اسلامی تاریخ کے واقعات وحادثات اور اس کے آثار و روایات کو انہوں نے بکثرت پیش کیا ہے جس سے ان کا مقصد مسلمانوں میں اپنے شاندار ماضی کا شعور بیدار کرنا تھا۔ انیسویں صدی میں برصغیر میں استعمار کی ایک خاص کوشش یہ رہی کہ مسلمانوں کی تاریخ کو مسخ کیا جائے۔ ان کی قابل فخر سیاسی، دینی اور تمدنی شخصیات کے تابناک چہروں کو غبار آلودہ کیا جائے۔ مستشرقین کی تحقیقات کا ایک سیاسی مقصد مسلمانوں کو اپنے شاندار ماضی سے منحرف کرنا تھا۔ کیونکہ مسلمانوں کا ماضی انتہائی روشن پرشکوہ اور جاندار تھا۔ چنانچہ ہندو جنہیں انگریز حکومت کی مکمل سرپرستی حاصل تھی بضد تھے کہ اسلامی تاریخ کو نصاب سے خارج کیا جائے۔ علامہ نے ۱۹۳۲ء میں ایک جلسہ میں فرمایا:

> ''تاریخ اجتماعی حیثیت سے انسانی روح کی ایک حرکت ہے۔ روح انسانی کا کوئی ماحول نہیں بلکہ تمام عالم اس کا

ماحول ہے۔ اگر اسے کسی قوم کی ملکیت سمجھا جائے تو یہ اس کی تنگ نظری کا ثبوت ہے۔ فرمایا: ''میں اٹلی میں تھا تو مجھے ایک شخص پرنس کیتانی ملا۔ وہ اسلامی تاریخ کا بہت دلدادہ ہے۔ اس نے تاریخ پر اتنی کتابیں لکھی ہیں اور اس قدر روپیہ صرف کیا ہے ہے کہ کوئی اسلامی سلطنت اس کے ترجمے کا بندوبست نہیں کرسکتی۔ اس نے لاکھوں روپیہ صرف کر کے تاریخی مواد جمع کیا ہے۔ جب میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کو اسلامی تاریخ سے کیوں دلچسپی ہے تو انہوں نے کہا: اسلامی تاریخ عورتوں کو مرد بنا دیتی ہے۔''(۱)

اسلامی تاریخ کی اصل اہمیت و وقعت قرآن مجید سے واضح ہے جس میں متعدد اقوام کے عروج و زوال اور اس کے اسباب و علل پر موثر ترین انداز میں گفتگو کی گئی ہے۔ علامہ اقبال نے قرآن حکیم کی آیہ مبارکہ ﴿ولکل امۃ اجل﴾ کی وضاحت کرتے ہوئے کہا: ''اس آیت کو پیش نظر رکھیں تو اس کی حیثیت ایک مخصوص تعلیم کی ہے جس میں گویا بڑے حکیمانہ انداز میں یہ سمجھایا گیا ہے کہ امِ انسانی کا مطالعہ بھی ہمیں بطور اجسام نامیہ، علمی نہج پر کرنا چاہیے۔''(۲)

اقبال نے تاریخ کے حوالے سے قوموں کی تقدیر کو بڑے ایجاز اور اختصار کے ساتھ بیان کرتے ہوئے کہا:

میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیرِ اُمم کیا ہے
شمشیر و سناں اوّل، طاؤس و رباب آخر

(بالِ جبریل، ۵۲)

رموز بیخودی میں فلسفہ تاریخ پر بصیرت افروز بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''ہر قوم اپنے ماضی کی تاریخ کے مطالعہ سے خود شناسی کا شعور حاصل کرتی ہے اور اگر کوئی قوم اپنے ماضی کو بھلا دے تو وہ خود قصہ ماضی بن جاتی ہے۔ ماضی، حال اور مستقبل کا رابطہ ہی زندگی کے اوراق کی شیرازہ بندی کرتا ہے اور ملی روایات کی حفاظت ہی ملت کے وجود کو برقرار رکھتی ہے۔ تاریخ کیا ہے؟ کیا یہ محض کوئی داستان یا قصہ یا افسانہ ہے؟ نہیں یہ تو خود آگاہی کا ذریعہ ہے۔ ملت اسی شعور کی قوت سے قائم رہتی ہے۔ اس کے ساز میں ماضی کے تمام نغمات محفوظ رہتے ہیں۔ اپنی تاریخ کی حفاظت کرنا چاہیے، انفاس رفتہ سے زندگی حاصل ہوسکتی ہے۔ ماضی ہمارے حال کو جنم دیتا ہے اور

حال مستقبل کو معرض وجود میں لاتا ہے۔ ملت کو اپنی بقا کے لیے اپنا رشتہ ماضی، حال اور مستقبل سے ہرگز منقطع نہیں کرنا چاہیے۔ (۳)

زمانہ ایک، حیات ایک، کائنات بھی ایک
دلیل کم نظری قصۂ جدید و قدیم

(ضربِ کلیم، ۲۶)

اقبال کے نزدیک جس طرح فرد جسم و جان کے ربط سے زندہ ہے اسی طرح قوم اپنی روایات کے تسلسل سے زندہ رہتی ہے۔ فرد کی موت اس وقت واقع ہوتی ہے جب اس کا سرچشمہ حیات خشک ہو جاتا ہے۔ قوم اس وقت مرتی ہے جب وہ اپنے نصب العین کو ترک کر دیتی ہے:

مرگِ فرد از خشکیٔ رودِ حیات
مرگِ قوم از ترکِ مقصودِ حیات

(رموزِ بیخودی، ۱۱۸)

تاریخی شعور، وسیع علمی مطالعہ اور گہرے تجربے کا متقاضی ہے تاکہ واقعات کے پس پردہ نتائج کا ادراک کیا جا سکے۔ علامہ اقبال لکھتے ہیں: ''تاریخ سے دلوں کو گرمانا اور ان میں جوش اور ولولوں کا ابھرنا، وہ ابتدائی مرحلہ ہے جس سے رفتہ رفتہ تاریخ کا نشو ونما ایک علم کے طور پر ہوتا ہے۔ اس کے علمی مطالعہ کے لیے بڑے وسیع اور بڑے گہرے تجربے کے ساتھ بڑی پختہ عقل عملی کی ضرورت ہے۔ علاوہ ازیں زندگی اور زمانے کی ماہیت کے بارے میں بعض اساسی تصورات کا صحیح ادراک بھی ضروری ہے۔'' (۴)

''اس سے بڑی غلط بیانی اور کیا ہو سکتی ہے کہ قرآن پاک میں کوئی ایسا خیال موجود نہیں جو فلسفہ تاریخ کا سرچشمہ بن سکے، حالانکہ بہ نگاہ حقیقت دیکھا جائے تو ابن خلدون کا مقدمہ سرتاسر اس روح سے معمور ہے جو قرآن کی بدولت اس میں پیدا ہوئی۔ وہ اقوام وامم کے عادات وخصائل پر حکم لگاتا ہے تو اس میں بھی زیادہ تر

قرآن پاک ہی سے استفادہ کرتا ہے۔'' (۵) اقبال ماضی کے عمیق مطالعے کی ضرورت پر زور دیتے ہیں تا کہ حال کا تعین ہو سکے۔ انہوں نے فرمایا:

''ایک دوسری بات جس پر میں زور دینا چاہتا ہوں وہ ہمارا انکشاف ماضی ہے۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو صرف اپنے ماضی سے محبت کرتے ہیں۔ میں تو مستقبل کا معتقد ہوں مگر ماضی کی ضرورت مجھے اس لیے ہے کہ میں حال کو سمجھوں، اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ سرچشمہ تہذیب وشائستگی کو سمجھا جائے تا کہ یہ معلوم ہو سکے کہ آج دنیائے اسلام میں کیا ہو رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں چاہتا ہوں کہ آپ ماضی کو سمجھیں، چونکہ ہم جدید تہذیب وشائستگی کے اصولوں سے ناواقف ہیں اس لیے ہم علوم جدیدہ کو حاصل کرنے میں دیگر اقوام سے پیچھے رہ گئے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ ان گم گشتہ رشتوں پر نظر ڈالیں جن کے ذریعے سے ہم ماضی و مستقبل سے وابستہ ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ علوم جدیدہ پر اصول استقرائی عائد کیا گیا ہے، یہ وہ نعمت ہے جو قرآن شریف نے دنیا بھر کو عطا فرمائی ہے، اس طریقہ استقرائی کے نتائج وثمرات ہم کو آج نظر آ رہے ہیں۔ میں گذشتہ بیس برس سے قرآن شریف کا بغور مطالعہ کرتا ہوں، ہر روز تلاوت کرتا ہوں۔ مگر میں ابھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس کے کچھ حصوں کو سمجھ گیا ہوں۔ اگر خدا نے توفیق دی اور فرصت ہوئی تو میں ایک دن کامل تاریخ اس بات پر قلمبند کروں گا کہ دنیائے جدیدہ اس سطح حیات سے کسی طرح ترقی کرتی ہوئی بنی ہے جو قرآن شریف نے ظاہر کیا ہے۔'' (۶)

علامہ اقبال نے اسلامی تاریخ کے شکوہ وجلال کو اپنے کلام میں بار بار پیش کیا ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ میرا طبعی رجحان جدید کی نسبت قدیم کی طرف ہے۔ مسلمانوں کی عظمت رفتہ کو ''شراب کہن'' سے تعبیر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

شراب کہن پھر پلا ساقیا
وہی جام گردش میں لا ساقیا

(بال جبریل، ۱۲۴)

کبھی اسے نوائے رفتہ کا نام دیتے ہیں:

ع غزل سرائے و نوا ہائے رفتہ باز آور (زبورِ عجم، ۶)

کبھی اسے آتش رفتہ کہتے ہیں۔اور اپنی فکری زندگی کو گمشدہ اقدار کی بازیابی سے تعبیر کرتے ہیں:

میں کہ مری غزل میں ہے آتشِ رفتہ کا سراغ
میری تمام سرگزشت کھوئے ہوؤں کی جستجو

(بالِ جبریل،۱۱۳)

رومی کو یاد کرتے ہیں:

نہ اٹھا پھر کوئی رومی عجم کے لالہ زاروں سے
وہی آب و گل ایراں وہی تبریز ہے ساقی!

(بالِ جبریل،۲۷)

اور:

کیا نہیں ' اور غزنوی کار گہ حیات میں
بیٹھے ہیں کب سے منتظر اہلِ حرم کے سومنات

(بالِ جبریل،۱۱۲)

یا:

ع بھٹکے ہوئے آہو کو پھر سوئے حرم لے چل

اورنگ زیب برصغیر کی ایک عظیم تاریخی شخصیت ہے اس کے بارے میں اقبال رقم طراز ہیں:

''قومی سیرت کا وہ اسلوب جس کا سایہ عالمگیر کی ذات نے ڈالا ہے ٹھیٹھ اسلامی سیرت کا نمونہ ہے اور ہماری تعلیم کا مقصد ہونا چاہیے کہ اس نمونے کو ترقی دی جائے اور مسلمان ہر وقت اسے پیش نظر رکھیں۔''(۷)

فرد پر ملت کی برکات کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''یہ اس کی برکت ہے کہ میرے ماضی نے از سرِ نو زندہ ہو کر مجھ میں یہ احساس پیدا کر دیا ہے کہ وہ اب بھی میری ذات میں سرگرم کار ہے۔'' (۸)

علم الاقتصاد

اقتصادیات علامہ اقبال کی خاص توجہ کا موضوع ہے۔ نظم و نثر میں انہوں نے اس موضوع پر جا بجا اظہار خیال کیا ہے۔ ۱۹۰۳ء میں اردو زبان میں علم الاقتصاد کے عنوان سے ایک مستقل کتاب تحریر کی جو اردو میں اس موضوع پر پہلی کتاب ہے۔

ابتدا ہی سے یہ ان کی خواہش تھی کہ مسلمان عزت و احترام کی زندگی بسر کریں، کسی کے محتاج نہ ہوں اور کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلائیں کیونکہ شخصیت کو جو چیز کمزور کرتی ہے وہ دوسروں کے آگے دست سوال دراز کرنا ہے۔ اقبال کے نزدیک: ''غریبی قوائے انسانی پر بہت برا اثر ڈالتی ہے۔ بلکہ بسا اوقات انسانی روح کے مجلّا آئینے کو اس قدر زنگ آلود کر دیتی ہے کہ اخلاقی اور تمدنی لحاظ سے اس کا وجود عدم برابر ہو جاتا ہے۔'' (۱)

اقتصادی آزادی کے بغیر کوئی قوم سیاسی آزادی سے بہرہ مند نہیں ہو سکتی۔ اقتصادی قوت ہی دراصل سیاسی قوت کی اساس ہے۔ اس قوت کو حاصل کرنے کے لیے صنعت کو حتی الامکان فروغ دیا جائے تا کہ لوگوں کا معیار زندگی بلند ہو سکے۔ اقبال صنعت کی اہمیت کے حوالے سے کہتے ہیں: ''جاپانی قوم آج دنیا کی سب سے مہذب اقوام میں شمار ہوتی ہے اور محققینِ مغرب اس کی رفتار ترقی کو دیکھ کر حیران ہو رہے ہیں..... جاپان نے رموز حیات کو سب سے زیادہ سمجھا ہے۔ اس واسطے یہ ملک دنیوی اعتبار سے ہمارے لیے سب سے اچھا نمونہ ہے۔'' (۲)

(پس چہ باید کرد، ۸۳۸)

کسی بھی قوم کے اقتصادی استحکام کا دوسرا ذریعہ زراعت ہے۔ ''الارض للہ'' کی رو سے زمین اللہ کی ملکیت ہے۔ کسی حکومت یا فرد کی ملکیت نہیں۔ مسلمان صرف اس کا امین ہے۔ چنانچہ اقبال جاگیرداری اور زمینداری کا نظام کے مخالف ہیں جو فرد کے استحصال کا باعث بنتے ہیں۔ کاشتکار زمین کو بطور امانت اپنے پاس رکھ سکتا ہے جب تک وہ کاشت کرتا ہے یا بغیر استحصال کاشت کراتا ہے۔ اقبال نے فرمایا:

دِہ خدایا! یہ زمیں تیری نہیں تیری نہیں
تیرے آبا کی نہیں، تیری نہیں میری نہیں

(بال جبریل،۱۳۳)

تیسرا اہم ذریعہ معدنی وسائل ہیں۔ بڑی طاقتیں کمزور قوموں کے ایسے وسائل پر عموماً قبضہ کرنے کی کوشش کرتی ہیں اور ان پر تسلط کرنے سے گریز نہیں کرتیں۔ اس بارے میں علامہ اقبال کی نصیحت یہ ہے کہ ان طاقتوں کو اپنے وسائل حیات سے دور رکھا جائے:

از فریبِ او اگر خواہی اماں
اشترانش را ز حوضِ خود براں

(جاوید نامہ،۸۳۷)

انیسویں صدی میں سرمایہ داری نظام نے ایک دنیا کو اپنے پنجہء استبداد میں پکڑ لیا۔ بیسویں صدی کے آغاز میں اس نظام کے خلاف اشتراکی نظام معرض وجود میں آیا۔ اگرچہ بظاہر یہ اقتصادی نظام ایک دوسرے سے مختلف تھے لیکن اصل میں دونوں ایک ہی تھے۔ دونوں کا ہدف کمزوروں کا استحصال تھا۔ علامہ اقبال نے ان اقتصادی نظام کو عالم انسانی کے لیے مفید اور قابل عمل قرار دیا۔ انہوں نے فرمایا:

''سرمایہ داری کی قوت جب اعتدال سے تجاوز کر جائے تو دنیا کے لیے ایک قسم کی لعنت ہے۔ لیکن دنیا کو اس کے مضر اثرات سے نجات دلانے کا طریق یہ نہیں کہ معاشی نظام سے اس قوت کو خارج کر دیا جائے۔ جیسا کہ بولشویک تجویز کرتے ہیں۔ قرآن کریم نے اس قوت کو مناسب حدود کے اندر رکھنے کے لیے قانون میراث اور زکوۃ وغیرہ کا نظام تجویز کیا ہے اور فطرت انسانی کا ملحوظ رکھتے ہوئے یہی طریق قابل عمل بھی ہے۔ روسی بالشوزم یورپ کی ناعاقبت اندیشی اور خودغرض سرمایہ داری کے خلاف ایک زبردست ردعمل ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ مغرب کی سرمایہ داری اور روسی بالشوزم دونوں افراط وتفریط کا نتیجہ ہیں۔ اعتدال کی راہ وہی ہے جو قرآن نے

ہم کو بتائی ہے۔

شریعت حقہ اسلامیہ کا مقصود یہ ہے کہ سرمایہ داری کی بنا پر ایک جماعت دوسری جماعت کو مغلوب نہ کر سکے اور اس مدعا کے حصول کے لیے میرے عقیدے کی رو سے وہی راہ آسان اور قابل عمل ہے جس کا انکشاف شارع علیہ السلام نے کیا ہے۔

''اسلام سرمایہ کی قوت کو معاشی نظام سے خارج نہیں کرتا بلکہ فطرت انسانی پر ایک عمیق نظر ڈالتے ہوئے اسے قائم رکھتا ہے اور ہمارے لیے ایک ایسا نظام تجویز کرتا ہے جس پر عمل پیرا ہونے سے یہ قوت کبھی اپنے مناسب حدود سے تجاوز نہیں کر سکتی۔ مجھے افسوس ہے کہ مسلمانوں نے اسلام کے اقتصادی پہلو کا مطالعہ نہیں کیا، ورنہ ان کو معلوم ہوتا کہ اس خاص اعتبار سے اسلام کتنی بڑی نعمت ہے۔ میرا عقیدہ ہے ''فاصبحتم بنعمتہ اخوانا'' میں اسی نعمت کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ کسی قوم کے افراد صحیح معنوں میں ایک دوسرے کے اخوان نہیں ہو سکتے جب تک کہ وہ ہر پہلو سے ایک دوسرے کے ساتھ مساوات نہ رکھتے ہوں۔''(۳)

وراثت اور زکوۃ کا مقصد یہ ہے کہ دولت صرف اغنیاء تک محدود نہ رہے۔ بلکہ زیادہ سے زیادہ ہاتھوں میں گردش کرے۔ قرآن مجید میں مسلمانوں پر یہ فرض کیا گیا کہ وہ فلاح عامہ کے لیے جو مال و دولت ضرورت سے زائد ہے اسے خرچ کریں۔ مسلمانوں نے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا کہ وہ خدا کی راہ میں کیا خرچ کریں تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿قل العفو﴾ یعنی جو ضرورت سے زیادہ ہے وہ خرچ کریں۔

علامہ اقبال نے روس کے اشتراکی نظام کے مقابلے میں یہ امید ظاہر کی کہ مسلمان فرمان خداوندی کے مطابق ﴿قل العفو﴾ کے حکم پر عمل کرتے ہوئے ضرورت سے زائد مال و دولت از خود خدا کی راہ میں خرچ کریں گے۔

جو حرف ''قل العفو'' میں پوشیدہ ہے اب تک
اِس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار!

(ضرب کلیم، ۱۳)

اقبال کے نزدیک شریعت کی غایت الغایات یہ ہے کہ معاشرے میں کوئی فرد کسی دوسرے فرد کا محتاج نہ رہے۔

کس نگردد در جہاں محتاج کس

نکتہ شرع مبیں این است و بس

(پس چہ باید کرد، ۳۲)

شریعت میں زکوۃ، وراثت اور انفاق بالعفو ایک ایسا متوازن نظام ہے جو ارتکاز دولت کو ختم کرنے اور ناداروں کو افلاس کی مصیبت سے نجات دلانے میں نہایت مدد و معاون ہے۔ علامہ اقبال کی یہ خواہش اور کوشش تھی کہ برصغیر میں مسلمان دوبارہ عزت و آبرو کی زندگی حاصل کریں اور کسی کے آگے دست سوال دراز نہ کریں۔ کیونکہ سوال خودی کو کمزور کر دیتا ہے۔ اس حوالے سے دیکھا جائے تو انہوں نے برصغیر میں ایک آزاد مسلم ریاست کا تصور بنیادی طور پر اس لیے پیش کیا کہ مسلمان نفاذ شریعت کی برکات سے کسی کے محتاج نہ رہیں۔ انہوں نے قائداعظم کے نام ۱۹۳۷ء میں ایک خط میں لکھا:

''شریعت اسلامیہ کے طویل و عمیق مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اسلامی قانون کو معقول طریق پر سمجھا اور نافذ کیا جائے تو ہر شخص کو کم از کم معمولی معاش کی طرف سے اطمینان ہو سکتا ہے۔ ایک مشکل تو یہ ہے کہ کسی ایک آزاد اسلامی ریاست یا ایسی چند ریاستوں کی عدم موجودگی میں شریعت اسلامیہ کا نفاذ اس ملک میں محال ہے۔ سالہا سال سے میرا یہی عقیدہ رہا ہے اور اب بھی اسے ہی مسلمانوں کے افلاس اور ہندوستان کے امن کا بہترین حل سمجھتا ہوں۔'' (۴)

چیست قرآن؟ خواجہ را پیغامِ مرگ

دستگیرِ بندۂ بے ساز و برگ

(جاوید نامہ، ۸۰)

یعنی قرآنی حکمت یہ ہے کہ ارتکاز دولت کو ختم کیا جائے اور ناداروں اور مفلسوں کی مدد کی جائے۔

علم شعر

علم شعر اقبال کی خاص توجہ کا مرکز رہا۔ یہ ان کی روح کی زبان تھی۔ انہوں نے اپنے دینی، علمی، سیاسی، اقتصادی، تاریخی اور تمدنی افکار کے لیے شعر وسیلۂ ابلاغ بنایا جسے اثر آفرینی میں معجزے سے بھی تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ فارسی اور خصوصاً اردو شاعری کی روایت کو اگر انیسویں صدی تک موضوع تحقیق بنایا جائے تو ثابت ہوتا ہے کہ شعر کے مضامین عموماً پس اور پیش پا افتادہ تھے جنہیں تکرار کے ساتھ بیان کیا جاتا تھا۔ اہم ترین مضامین افلاطونی خیالات تھے یعنی ہستی ایک سراب ہے اور عالم تمام حلقہ دام خیال ہے۔ نفی خودی، گوشہ نشینی، ترک دنیا، ملامت کشی، قناعت پسندی، مجبوری اور نومیدی شعر کا سرمایہ تھا۔ شعراء جس قدر غم انگیز اور رقت افزا مضامین باندھتے ان کے اشعار اتنے ہی پسند کئے جاتے۔ شاعر اپنے آپ کو نکما، ناسزا اور ناروا کہہ کر پکارتا اور اس پر خوش ہوتا۔ شاعر کی نزاکت طبع کا یہ عالم ہو چکا تھا کہ اسے ہوا کے جھونکے سے مجروح کیا جاسکتا تھا اور رگ گل سے باندھا جاسکتا تھا۔ بقول اقبال:

از رگِ گل می تواں بستن ترا
از نسیمے می تواں خستن ترا

(اسرار خودی، ۳۷)

شعر اعلیٰ مضامین سے عاری اور احساس سے محروم ہو کر بے روح ہو چکا تھا۔ علامہ اقبال نے شعر کو اعلیٰ مضامین سے از سر نو زندگی بخشی۔ اس کی قدر و قیمت کو بلند کیا۔ شاعری کو پیغمبری کا وارث ٹھہرایا اور کہا:

شعر را مقصودِ اگر آدم گری است
شاعری ہم وارثِ پیغمبری است

(جاوید نامہ، ۶۳۲)

انہوں نے شعر برائے شعر نہیں کہا بلکہ اس فن کو اپنے بلند و بالا اہداف کے موثر اظہار کے لیے استعمال کیا اور کہا:

''میں نے کبھی اپنے آپ کو شاعر نہیں سمجھا اس واسطے کوئی میرا رقیب نہیں اور نہ میں کسی کو اپنا رقیب تصور کرتا ہوں۔ فن سے مجھے کبھی دلچسپی نہیں رہی۔ ہاں بعض مقاصد رکھتا ہوں جن کے بیان کے لیے اس ملک کے حالات و روایات کی رو سے میں نے نظم کا طریقہ اختیار کیا ہے''، ورنہ:

نہ بینی خیر ازاں مرد فرو دست

کہ برمن تہمت شعر و سخن بست(۱)

(پیام مشرق، ۱۷)

اگرچہ اقبال رومی کی طرح فن شعر کو اہمیت نہیں دیتے، لیکن ان کا شعر فن کا بہترین نمونہ ہے جسے علمائے ایران نے معجزہ شعر قرار دیا ہے۔(۲) عموماً دیکھا گیا ہے کہ شاعر کی توجہ جب زیادہ تر لفظ کی طرف ہو تو معنی کمزو ہو جاتے ہیں اور اگر زیادہ توجہ معنی کی طرف ہو تو لفظ کمزور ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہ اقبال کا شعر ہے جس میں لفظ و معنی کا امتزاج اپنے کمال حسن کو پہنچا ہوا ہے۔ اس سے علماء بھی رہنمائی لیتے ہیں اور ماہرین فن بھی۔ سیاستدان بھی مطالب اخذ کرتے ہیں اور عرفان بھی۔ ان کے شعر میں دینی و دانشی تمام علوم جمع ہو گئے ہیں۔ اس بنا پر ان کا شعر نہایت موثر اور معتبر ہے۔ ان کا ہر مصرع ان کے خون کا قطرہ ہے:

برگ گل رنگیں ز مضمون من است

مصرع من قطرۂ خون من است

(پیام مشرق، ۱۷)

یہ اقبال کے شعر کا اعجاز مسیحائی ہے کہ اس نے قوم کو ایک نئی زندگی عطا کی۔ اقبال فوت ہو گئے لیکن ان کا شعر ان کی وفات کے بعد بھی اہل نظر کے لیے زندہ، موثر اور روح پرور ہے:

اے بسا شاعر کہ بعد از مرگ زاد
چشم خود بر بست و چشم ما کشاد

(اسرارِ خودی، ۷)

یعنی اکثر ایسا ہوا ہے کہ شاعر اپنی موت کے بعد پیدا ہوا۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور ہماری آنکھیں کھول دیں۔ فن شعر کے متعلق علامہ اقبال نے کابل میں تقریر کرتے ہوئے کہا:

''میرا عقیدہ ہے کہ آرٹ یعنی ادبیات یا شاعری یا مصوری یا موسیقی یا معماری، ان میں سے ہر ایک زندگی کی معاون اور خدمتگار ہے..... شاعر قوم کی بنیاد کو آباد بھی کر سکتا ہے اور برباد بھی۔ شعرا پر لازم ہے کہ وہ جوانان ملت کے سچے رہنما بنیں.....'' حیات نبوی سے ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے کہا:

''ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حضور عرب کے مشہور شاعر امراء القیس کے کچھ اشعار پڑھے گئے۔ ارشاد ہوا: **اشعراء الشعراء وقائدھم الی النار**'' یعنی وہ تمام شاعروں میں بہترین شاعر اور دوزخ کی طرف ان کا قائد ہے۔ علامہ کے نزدیک فن شعر میں جو چیز حقیقتاً قوم کی زندگی کے ساتھ تعلق رکھتی ہے وہ تخیل ہے جس کو شاعر کے سامنے پیش کرتا ہے اور وہ بلند نظریات ہیں جن کو وہ قوم میں پیدا کرنا چاہتا ہے۔ قومیں شعراء کی ہمت سے پیدا ہوتی ہیں اور اہل سیاست سے نشو ونما پا کر مر جاتی ہیں۔ (۳) حضرت علامہ اقبال نے یہاں نمونے کے طور پر اپنے یہ تین شعر پڑھے۔

دو دستہ تیغم و گردوں برہنہ ساخت مرا — فساد کشیدہ بروئے زمانہ آخت مرا
من آں جہان خیالم کہ فطرت ازلی — جہان بلبل وگل را شکست وساخت مرا
نفس بہ سینہ گدازم کہ طائر حرمم — تواں ز گرمیٔ آوازِ من شناخت مرا

(زبور عجم، ۵۱۴)

شعر کا اصل سرمایہ تخیل اور احساس ہے۔ شعریت اقبال کے نزدیک ثانوی حیثیت رکھتی ہے۔ چونکہ ان کا

نصب العین ملت اسلامیہ کا احیاء تھا، اس لیے انہوں نے نے شعر کو ایک نئی جہت اور ایک نئی روح عطا کی اور کہا:

پس از من شعر من خوانند و دُر یابند و می گویند

جہانے را دگر گوں کرد یک مردِ خود آگا ہے

(زبورِ عجم، ۴۹۲)

تاریخ ادب میں اکثر شاعر ایسے نظر آتے ہیں جو اپنے اندر کی دنیا سے باہر قدم نہیں رکھتے۔ غم جانانہ اور شکایت زمانہ سے انہیں فرصت نہیں ملتی۔ وہ نہ نظام حیات کا مشاہدہ کرتے ہیں اور نہ معاشرتی مسائل پر نظر ڈالتے ہیں۔ علامہ اقبال کے شعر کا افق نہایت تابناک اور وسیع ہے۔ انہوں نے انفاس و آفاق، قدیم و جدید، مشرق و مغرب، روح اور مادہ پر یکساں انداز میں نظر ڈالی ہے۔ اقبال کے نزدیک جو چیز فلسفہ کو شعر بناتی ہے سوز دل ہے۔ (۴) جس سے انسان میں عزم و ہمت اور جرأت و جسارت پیدا ہوتی ہے۔ انہوں نے فرمایا: ''مشرقی ادبیات اپنی ظاہری دلفریبیوں اور دلکشیوں کے باوجود اس روح سے خالی ہیں جو انسانوں کے لیے امید، ہمت اور جرأت عمل کا پیغام ہوتی ہے اور جسے زندگی کے جوش اور ولولے سے تعبیر کرنا چاہیے۔ ۱۹۰۸ء میں انگلستان سے واپس آیا تو میرے نزدیک یورپی ادبیات کی حیثیت بھی تقریباً وہی تھی جو مشرقی ادبیات کی تھی۔ ان حالات میں میرے دل میں کشمکش شروع ہوئی کہ ان ادبیات میں روح پیدا کرنے کے لیے کوئی نیا سرمایہ حیات فراہم کرنا چاہیے۔ (۵)

اقبال نے اگرچہ طبعاً شعر سے بے اعتنائی کا اظہار کیا لیکن یہ ان کا شعر ہی ہے جو اثر آفرینی کے لحاظ سے ایک دنیا کے دلوں میں اتر گیا۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری نے کہا: اقبال ہمارے لیے مسیحا بن کر آیا ہے اور اس نے مردوں میں زندگی کی لہر دوڑا دی ہے۔ پروفیسر نکلسن نے کہا: اقبال کی شاعری نے نوجوان مسلمانوں میں بیداری پیدا کر دی ہے اور بعض نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ جس مسیحا کا انتظار تھا وہ آ گیا ہے۔ سر تھامس آرنلڈ نے کہا: ہندوستان میں حرکت تجدید نے اپنا ممتاز ترین ظہور سر محمد اقبال کی شاعری میں حاصل کیا ہے۔ مولانا گرامی نے کہا: اہل بصیرت کے نقطہ نظر سے اقبال نے پیغمبری کی ہے اگرچہ ہم انہیں پیغمبر نہیں کہہ سکتے۔ ایران کے ملک الشعراء

بہار نے کہا: عصر جدید عصر اقبال ہے۔(۶)

علوم دانشی

علامہ اقبال نے اسلامی شعور کے احیاء میں غیر معمولی کوشش کی اور اپنے روح پرور کلام سے مسلمانوں کو خواب غفلت سے بیدار کیا اور انہیں علم و عمل کی راہوں پر گامزن ہونے کی مسلسل تلقین کی۔ عظمت رفتہ کی بازیابی کے لیے مسلمانوں کی دینی، سیاسی اور ثقافتی تاریخ کے مطالعہ سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ مسلمانوں نے قرآنی تعلیمات پر عمل کر کے زندگی کے ہر میدان میں نمایاں کامیابیاں حاصل کیں۔ انہوں نے فرمایا: ''قرآن پاک کا رجحان اس طرف ہے کہ فکر کی بجائے عمل پر زور دیا جائے۔(۱) مذہب کی بدولت ہمیں جس قسم کا علم حاصل ہوتا ہے اسے سائنس کی زبان میں سمجھا جائے۔''(۲)

علامہ اقبال اس حقیقت کا اظہار نہایت اعتماد اور تکرار کے ساتھ کرتے ہیں کہ عصر حاضر کے بیشتر علوم مسلمانوں ہی کی علمی کاوشوں اور فنی کوششوں کا نتیجہ ہیں۔ تہذیب جدید کے چراغ مسلمانوں کی محنت سے روشن ہوئے ہیں:

بجھ کے شمع ملت بیضا پریشاں کر گئی
اور دیا تہذیب حاضر کا فروزاں کر گئی

(بانگِ درا، ۱۵۶)

علوم و فنون کا انکشاف اور ان میں تحقیق و تجسس کا آغاز مسلمانوں نے کیا لیکن ان سے فائدہ اہل مغرب نے اٹھایا۔ علامہ کے الفاظ کے مطابق بیج بونے والے صحرانشین مسلمان تھے لیکن اس کا حاصل اٹھانے والے افرنگی بن گئے۔

دانہ آں صحرا نشیناں کاشتند حاصلش افرنگیاں برداشتند

(مثنوی مسافر، ۸۸۰)

اقبال نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات کو مصدر علوم قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں: ''دیکھا جائے تو

یوں نظر آئے گا جیسے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی کی حیثیت دنیائے قدیم اور جدید کے درمیان ایک واسطہ کی ہے۔ بہ اعتبار اپنے سرچشمہ وحی کے آپ کا تعلق دنیائے قدیم سے ہے۔ لیکن بہ اعتبار اس کی روح کے دنیائے جدید سے۔ یہ آپ ہی کا وجود ہے کہ زندگی پر علم وحکمت کے وہ تازہ سرچشمے منکشف ہوئے جو اس کے آئندہ رخ کے عین مطابق تھے۔'' (۳) مزید رقم طراز ہیں:

''جہاں تک اسلام کا تعلق ہے اس کی عقلی اساسات کی جستجو کا آغاز آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات مبارک ہی سے ہو گیا تھا۔ آپ ہمیشہ دُعا فرماتے تھے ''اے اللہ مجھے اشیاء دکھا جیسی کہ وہ فی الواقع ہیں''۔ ''قرآن مجید کا حقیقی مقصد تو یہ ہے کہ انسان اپنے اندر ان گونا گوں روابط کا شعور پیدا کرے جو اس کے اور کائنات کے درمیان قائم ہیں۔ قرآنی تعلیمات کا یہی وہ پہلو ہے جس کے پیش نظر گوئٹے نے بہ اعتبار ایک تعلیمی قوت اسلام پر من حیث الکل تبصرہ کرتے ہوئے ایکرمن سے کہا تھا: ''تم نے دیکھا اس تعلیم میں کوئی خامی نہیں۔ ہمارا نظام اور ہم پر کیا موقوف ہے کوئی انسان بھی اس سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔'' (۴)

قرآن مجید نے کائنات کے حقائق پر غور کرنے کی خاص دعوت دی ہے۔ اقبال کہتے ہیں: ''سقراط کی توجہ صرف عالم انسانی پر تھی اس کے نزدیک انسان کے مطالعہ کا بہترین موضوع انسان ہی ہو سکتا ہے، نہ کہ نباتات اور حشرات یا ستاروں کی دنیا۔ مگر اس سے کس قدر مختلف ہیں قرآن پاک کی تعلیمات، جس کا ارشاد ہے کہ شہد کی مکھی ایسی حقیر شے بھی وحی الٰہی سے بہرہ ور ہوئی اور جس نے بار بار اس امر کی دعوت دی کہ ہواؤں کے مسلسل تغیر وتبدل کا مشاہدہ کیا جائے۔ نیز دن رات کے اختلاف، تاروں بھرے آسمان اور بادلوں کا جو فضائے لامحدود میں تیرتے پھرتے ہیں۔ سقراط کے شاگرد رشید افلاطون کو بھی ادراک بالحواس سے نفرت رہی'' ..... برعکس اس کے قرآن مجید نے سمع وبصر کا شمار اللہ تعالیٰ کے گراں قدر انعامات میں کیا۔ (۵)

یونانی فلسفہ صرف فکر تک محدود تھا جب کہ قرآن مجید نے کائنات کو تختہ تعلیم بنانے اور اس کے مادی ومعنوی حقایق واسرار کو دریافت کرنے اور ان سے مستفید ہونے کی تاکید کی۔ مسلمانوں نے اپنے سے پیشتر علماء کے علوم سے یقیناً استفادہ کیا اور بہت سے مطالب دوسری اقوام خصوصاً یونانیوں، ایرانیوں اور ہندوؤں سے اخذ کئے۔ پھر تحقیقی نقطہ نظر سے ان پر تنقید کی اور علمی انکشافات کی نئی نئی راہیں کھولیں۔ اقبال مسلمانوں نے تحقیقی عمل سے

کنارہ کش ہو جانے پر کہتے ہیں:

کس طرح ہوا کند ترا نشتر تحقیق؟
ہوتے نہیں کیوں تجھ سے ستاروں کے جگر چاک؟

(ارمغانِ حجاز، ۴۳)

علامہ اقبال جدید سائنس کے ایسے مآخذ کی جستجو میں رہے جن کے آثار مسلمان حکماء کی تحریروں میں پائے جاتے ہیں۔ لیکن ان کے نزدیک اس اہم کام کے لیے ایسے عربی دان علماء کی ضرورت ہے جو سائنس کے مخصوص شعبوں سے آگاہی رکھتے ہوں۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں: ''اسلامی ثقافت کے مورخ کی مشکل زیادہ تر اس سبب سے ہے کہ عربی کے ایسے علماء تقریباً مفقود ہیں جو سائنس کے مخصوص شعبہ جات کے تربیت یافتہ ہوں۔''(۶) اس ضمن میں اقبال مزید لکھتے ہیں: ''ثقافتِ اسلامیہ کا محقق آج بھی اس ثقافت کی داخلی معنویت کے فہم وادراک سے بمراحل دور ہے۔ نامور فاضل بریفالٹ اپنی تصنیف ''تشکیل انسانیت'' میں (جو ایک ایسی کتاب ہے جسے اقوام وملل کی ثقافتوں کے مطالعہ وجستجو کرنے والے ہر محقق کو پڑھنا چاہیے) ہمیں بتاتا ہے کہ تجرباتی طریق سے ہمارا تعارف کرانے کا سہرا نا روجر بیکن کے سر ہے اور نا اس کے بعد اس کے ہم نام فرانسیس بیکن (Farncis Beacon) کے سر۔ مزید یہ کہ بیکن کے عہد تک عربوں کا تجرباتی طریق اچھی طرح سے شائع ہو چکا تھا اور بڑے ذوق وشوق سے اس کی تحصیل اور مطالعہ یورپ کے طول وعرض میں کیا جاتا تھا۔''

> ''میرے پاس اس امر کے باور کرنے کے معقول وجوہ موجود ہیں کہ ڈیکارٹ کے منہاج تحقیق (Method) اور بیکن کے جدید طریق تحقیق کے اصلی سرچشمے کا سراغ تاریخ علوم کے ماضی بعید میں منطق یونانی کے اسلامی ناقدین مثلاً ابن تیمیّہ، غزالی، رازی اور شہاب الدین سہروردی المقتول کے خیالات وتحریرات میں جا کر لگتا ہے۔''(۷)

علامہ اقبال اس حقیقت کو تکرار کے ساتھ واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ یورپ کا جدید تمدن مسلمان علماء کے علوم کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ فرماتے ہیں:

''یورپ میں جذبہ انسانیت کی تحریک بڑی حد تک ان قوتوں کا نتیجہ تھی جو اسلامی فکر سے بروئے کار آئیں۔

یہ کہنا مطلق مبالغہ نہیں ہے کہ جدید یورپین جذبہ انسانیت کا جو ثمر جدید سائنس اور فلسفہ کی شکل میں برآمد ہوا ہے اسے کئی لحاظ سے اسلامی تمدن کی توسیع پذیری کہا جاسکتا ہے۔'' اقبال مزید فرماتے ہیں: ''آج کل کے مسلمانوں کی جہالت کا یہ عالم ہے کہ جو کچھ ایک بڑی حد تک خود ان کے تمدن سے برآمد ہوا ہے وہ اسے بالکل غیر اسلامی تصور کرتے ہیں۔ مثلاً اگر کسی مسلم حکیم کو یہ معلوم ہو کہ آئین سٹائین کے نظریہ سے کس قدر ملتے جلتے خیالات پر اسلام کے سائنٹیفک حلقوں میں سنجیدگی سے بحث مباحثے ہوتے تھے (ابوالمعالی جس کا قول ابن رشد نے نقل کیا ہے) تو آئین سٹائین کا موجودہ نظریہ ان کو اتنا اجنبی معلوم نہ ہو۔'' (۸) وقت کے متعلق برگساں کے عقیدے بھی ہمارے صوفیوں کے لیے کوئی نئی چیز نہیں۔ (۹)

اقبال مسلمان حکماء کو یورپی حکماء پر زمانی ترجیح دیتے ہوئے کہتے ہیں۔

''بیکن، ڈیکارٹ اور مل یورپ کے سب سے بڑے فلاسفر مانے جاتے ہیں جن کے فلسفہ کی بنیاد تجربہ اور مشاہدہ پر ہے۔ لیکن حالت یہ ہے کہ ڈیکارٹ کا اصول امام غزالی کی احیاء العلوم میں موجود ہے اور ان دونوں میں اس قدر مطابقت ہے کہ ایک انگریز مؤرخ نے لکھا ہے کہ اگر ڈیکارٹ عربی جانتا ہوتا تو ہم ضرور اعتراف کرتے کہ ڈیکارٹ سرقہ کا مرتکب ہوا ہے۔ راجر بیکن خود ایک اسلامی یونیورسٹی کا تعلیم یافتہ تھا۔ جان اسٹوارٹ مل نے منطق کی شکل اوّل پر جو اعتراض کیا ہے بعینیہ وہی اعتراض امام فخر الدین رازی نے بھی کیا ہے اور مل کے فلسفے کے تمام اصول شیخ بوعلی سینا کی مشہور کتاب الشفا میں موجود ہیں۔ غرض یہ کہ تمام وہ اصول جن پر علوم جدیدہ کی بنیاد ہے مسلمانوں کے فیض کا نتیجہ ہیں۔ بلکہ میرا دعویٰ ہے کہ نہ صرف علوم جدیدہ کے لحاظ سے بلکہ انسان کی زندگی کا کوئی پہلو اور اچھا ایسا نہیں ہے جس پر اسلام نے بے انتہا روح پرور اثر نہ ڈالا ہو۔'' (۱۰)

مذکورہ بیان کو حضرت علامہ نے فارسی کے اشعار میں یوں پیش کیا ہے:

عصر حاضر زادۂ ایامِ تست　　مستی او از مئے گلفامِ تست

شارح اسرارِ او تو بودہ ای　　اولین معمار او تو بودہ ای

(مثنوی مسافر، ۸۳۸)

یعنی عصر حاضر کی آنکھیں تمہاری آغوش علم میں کھلی ہیں۔اس کی مستی تمہاری مئے گلفام کا اثر ہے۔اس کے اسرار کے مفسر تم ہو اور اس کے اولین معمار بھی تم ہو۔

اقبال اپنی بات کے اثبات میں مزید لکھتے ہیں:''نصیرالدین طوسی کی تصنیف علم اقلیدس(Euclids) روم میں ۱۵۹۴ء میں طبع ہوئی اور جو والیس (John Wallis) نے اسے سترھویں صدی کے کم وبیش وسط میں آکسفورڈ یونیورسٹی کے نصاب میں داخل کیا۔طوسی نے اقلیدس کے موضوعہ متوازی(Parallel Postulate) کی اصلاح کرنے کی کوشش کی۔اسی نے یورپ میں مکان(Space) کے مسئلے کی بنیاد رکھی۔''(۱۱)

پہلی صدی ہجری یعنی آٹھویں صدی عیسوی میں اسلامی فتوحات کے نتیجے میں مسلمان مختلف اقوام کی تہذیب وتمدن سے آشنا ہوئے اور انہوں نے ان کے علوم وفنون کا مطالعہ کیا پھر عربی زبان میں منتقل کر کے انہیں اپنی تحقیق کا خاص موضوع بنایا۔مسلمانوں نے علوم کو پہلی دفعہ نظری اور عملی دونوں بنیادوں پر استوار کرنے کی کوشش کی۔مسلمانوں نے جن علوم دانش میں خاص خدمات انجام دیں وہ نمایاں طور پر یہ ہیں:

فلسفہ(Philosophy) ہندسہ(Geometry) ہیئت(Astronomy) طب(Medicine) جراحی (Surgery) کیمیا(Chemistry) طبیعات(Physics) عمرانیات(Sociology) اقتصادیات (Economics) سیاسیات(Politics) ریاضیات(Mathematics) الجبرا(Algebra) زراعت (Agriculture) اور ارتقاء(Evolution) وغیرہ۔

مسلمانوں نے نویں اور دسویں صدی عیسوی یعنی عباسی دور حکومت میں بغداد میں یونانی علوم کی کتب کے تراجم عربی زبان میں کیے۔یہ منصور اور مامون کا عہد تھا۔اسی طرح اندلیس میں سائنس کے اکثر شعبوں میں مسلمان حکماء نے اہم کام کیا جس سے یورپ میں علم کی روشنی پھیلی۔جب مسلمان اندلس سے ختم ہوئے تو ان کے اکثر علمی ذخائر بھی ختم کر دیے گئے۔وہاں کے عیسائیوں نے باب الراحلہ میں مسلمانوں کی بکثرت کتابوں کو نذر آتش کیا۔پھر بھی متعدد مخطوطات بچ گئے جو آج بھی یورپ کے بعض کتب خانوں کے گوشہ ہائے گمنامی میں پڑے ہیں۔اقبال نے نہایت دلسوزی سے کہا:

مگر وہ علم کے موتی ، کتابیں اپنے آبا جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارا
''غنی روزِ سیاہ پیرِ کنعاں را تماشا کن کہ نورِ دیدہ اش روشن کند چشمِ زلیخا را''

(بانگِ درا، ۱۲۰۷)

جدید علوم کی ابتدا یونانیوں سے نہیں ہوئی بلکہ مسلمانوں کی ان علمی کتابوں سے ہوئی جن کے تراجم عربی زبان سے لاطینی میں کئے گئے۔ لیکن اہل مغرب نے اس حقیقت کو تقریباً چھپانے کی کوشش کی۔ مسلمانوں کی علمی تحریک کا یورپ پر نہ صرف گہرا اثر ہے بلکہ مسلمانوں کا عظیم احسان ہے جس سے سائنسی طریق کار تفکر اور تدبر سے تجربہ اور مشاہدہ کی طرف معطوف ہوا۔ بریفالٹ کہتا ہے:

''آزادی، مساوات، اخوت، مشورہ اور عوامی رائے دہندگی کے بلند اصول جنہوں نے فرانسیسی انقلاب اور اعلان حقوق آزادی میں روح پھونکی، جنہوں نے امریکی آئین کی رہنمائی کی اور لاطینی امریکہ کی جدوجہد آزادی کو تقویت بخشی، وہ اصول مغربی ایجاد نہیں، بلکہ ان تمام کا منبع قرآن ہے۔ یہ امر واقعی ہے کہ عربوں کے بغیر موجودہ مغربی تہذیب جنم ہی نہ لیتی۔'' (۱۲) مسلمانوں کے علوم کا مرکز عباسیوں نے بغداد میں دارالحکمت کے نام سے تاسیس کیا۔ فاطمیوں نے قاہرہ میں دارالعلم قائم کیا اسی طرح اندلیس کے شہروں قرطبہ اور طیلطلہ کی یونیورسٹیوں کے ذریعہ یورپ علوم سے مستفید ہوا۔ مسلمانوں کی علمی کتابوں کے لاطینی میں ترجمے ہوئے۔ مسلمان علماء وحکماء کی بیشتر کتابوں کے ترجمہ کرنے والے یہودی علماء تھے جن کی کوشش سے اسلامی ثقافت کے اثرات یورپ پر مرتب ہوئے۔ چنانچہ فرانسیسی اور جرمن راہبوں نے علوم کی درسی کتب یہودی علماء سے پڑھیں۔ یہودی علماء نے پہلا مدرسہ آکسفورڈ میں قائم کیا۔ جہاں تیرھویں صدی عیسوی کے عالم راجر بیکن (Roger Beacon) نے تعلیم پائی۔ مشہور ہے کہ مسیحی یورپ نے مسلمانوں کے علوم راجر بیکن سے حاصل کیے۔ بیکن یہ اعتراف کرتا تھا کہ اس کے معاصرین کے لیے صحیح علم کا واحد ذریعہ عربی زبان اور اس کے علوم ہیں۔ اسے یہ بھی اقرار تھا کہ اس نے ارسطو کا فلسفہ ابن رشد کی تصانیف کے تراجم سے سمجھا۔ (۱۳)

اہل یورپ کے فکر ونظر میں انقلاب کا ایک باعث مذہبی اصلاح (Reformation) کی تحریک تھی جس

سے پرٹسٹنٹ مذہب کا ظہور ہوا۔ اس کا بانی مارٹن لوتھر تھا جس نے قربطہ اور طلیطلہ میں فلسفہ اور علوم اسلامی کی تعلیم پائی تھی۔ وہ اسلامی تعلیمات سے متاثر ہو کر کیتھولک چرچ کی اصلاح کے لیے اٹھا۔ مختلف علوم و معارف میں مسلمانوں نے تحقیق و تجسس کا غیر معمولی کام کیا چنانچہ یہاں چند نمایاں مسلمان حکماء کے نام پیش کئے جاتے ہیں۔ جنہوں نے مختلف سائنسی علوم میں اہم تحقیقی خدمات انجام دیں۔ محمد زکریا رازی دسویں صدی عیسوی میں (۸۶۵۔۹۲۵ء) دنیائے اسلام کا سب سے بڑا طبیب تصور کیا جاتا ہے۔ اس کی کتاب الحاوی کا ترجمہ ۱۲۷۹ء میں لاطینی زبان میں کیا گیا۔ ۱۹۳۵ء میں الحاوی طب کی ان کتابوں میں شامل تھی جو پیرس یونیورسٹی میں تدریس ہوتی تھیں۔ ۱۵۴۲ء میں یہ کتاب پانچ بار شائع ہوئی۔ (۱۴) زکریا رازی کی تصویر پیرس یونیورسٹی کی فیکلٹی آف میڈیسن کے ہال میں آج بھی آویزاں ہے۔ (۱۵) ابن الہیثم (متوفی ۹۶۵ء) اس نے علم بصریات کو درجہ کمال تک پہنچایا۔ بصریات پر اس کی کتاب ناپید ہے لیکن اس کا لاطینی ترجمہ موجود ہے۔ الہیثم نے انتشار نور، رنگ، نظر اور انعکاس کے زاویوں کے تعین پر بحث کی ہے۔ یہ الہیثم کی تحقیق ہے کہ بصارت اس چیز کا نام نہیں کہ شعاع آنکھ سے نکل کر مرئی چیز پر پڑتی ہے بلکہ مرئی چیز کی شکل آنکھ میں داخل ہو کر نظر آتی ہے۔ (۱۶)

ابن سینا دسویں گیارھویں صدی عیسوی (۱۰۳۷۔۹۸۰ء) سے متعلق عالم اسلام کی عظیم شخصیت ہے۔ طب میں اس کی کتاب القانون معروف ہے۔ بارھویں صدی عیسوی میں جیرارڈ نے اس کا لاطینی زبان میں ترجمہ کیا جو پانچ سو سال تک یورپ میں درسی کتاب کی حیثیت سے پڑھائی جاتی رہی۔ سترھویں صدی کے نصف اول تک جنوبی فرانس میں اس یک تدریس جاری تھی۔ (۱۷) ابن سینا نے پہاڑوں، پتھروں، معدنیات، زلزلوں، آندھی، پانی، حرارت اور خشکی وغیرہ کی تاثیرات پر بھی بحث کی ہے۔ (۱۸) ابن سینا کا شمار بلند پایہ فلسفیوں میں ہوتا ہے۔ فلسفہ پر اس کی کتاب الشفا کا لاطینی میں ترجمہ ہوا۔ راجر بیکن ابن سینا کو ارسطو کے بعد سب سے بڑا دانشور تسلیم کرتا ہے۔ (آرنلڈ میراث اسلام، ۴۹۹) اسی طرح جابر بن حیان ہے جس نے کیمسٹری کے موضوع پر ایک سو کے قریب رسائل قلمبند کیے۔ خراسان کا رہنے والا تھا۔ اسے اسلامی کیمسٹری کا باپ کہا جاتا ہے۔ بارہویں صدی عیسوی میں اس کی بعض کتابیں لاطینی میں ترجمہ ہوئیں جن کے سبب یورپ میں کیمسٹری پر ایک سو کے قریب رسائل قلمبند کئے۔ خراسان کا رہنے والا تھا۔ اسے اسلامی کیمسٹری کا باپ کہا جاتا ہے۔ بارھویں صدی عیسوی میں

اس کی بعض کتابیں لاطینی میں ترجمہ ہوئی جن کے سبب یورپ میں کیمسٹری کے علم کی ترویج ہوئی۔ اس نے دھاتوں کی ترتیب وتشکیل میں ارسطو کے نظریے کی اصلاح کی۔ جابر کی کتاب الکیمیا کا لاطینی زبان میں ترجمہ ۱۱۴۴ء میں ہوا۔

الخوارزمی (متوفی ۸۴۶ء) نے دنیا کو نہ صرف اعداد سے متعارف کرایا۔ بلکہ صفر اور اس کے استعمال کا طریقہ بھی سیکھایا۔ وہ پہلا شخص ہے جس نے جبر ومقابلہ پر کی کتاب لکھی۔ جیرارڈ نے جبر ومقابلہ کا ترجمہ لاطینی میں کیا۔ چنانچہ یہ کتاب بارہویں صدی سے سولہویں صدی عیسوی تک یورپ کی یونیورسٹیوں میں شامل نصاب رہی۔

ابو ریحان البیرونی (متوفی ۱۰۶۲) علم ہیئت (Astronomy) میں عظیم محقق کی حیثیت سے پہچانا جاتا ہے۔ اس کو الاستاد (The Teacher) کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ علم طبیعات (Physics) میں بلند مرتبہ کا حامل ہے۔ اس نے پہلی دفعہ زمین کے قطر کی پیائش کی جو موجودہ حساب سے نہایت قریب ہے۔

الکندی۔ عرب فلسفی تھا اس کے بعض رسائل لاطینی میں ترجمہ کئے گئے۔ اس کی ایک کتاب رسالہ فی النفس کا ایک نسخہ مصر کی لائبریری میں موجود ہے۔ (۱۹)

فارابی۔ معلم ثانی (The Second Teacher) کے نام سے معروف ہے۔ اس نے ارسطو کی کتابوں پر شرح لکھیں۔

غزالی۔ عالم اسلام کی ایک ممتاز شخصیت جس کے فلسفیانہ افکار نے یورپ کو متاثر کیا۔ ابھی اس کی وفات کو بیس سال نہیں ہوئے تھے کہ ۱۱۳۰ء میں اس کی دو کتابوں کا لاطینی میں ترجمہ کیا گیا۔ (۲۰) غزالی نے ارسطو کی منطق کا جس طرح رد کیا اس سے عقلی حکمت کے سارے نظریے متزلزل ہو گئے۔

ابن رشد۔ اندلس کا سب سے بڑا فلسفی تھا جو قرطبہ میں پیدا ہوا۔ ابن رشد نے ارسطو کی سہ گانہ شرحیں لکھیں جو طبیعات، کائنات اور روح سے متعلق ہیں۔ یہ کتابیں عبرانی اور لاطینی ترجموں کی صورت میں موجود ہیں۔

علامہ اقبال کی تحریروں میں مذکورہ علماء اور علوم کے متعدد حوالے ملتے ہیں جس سے ان کی مراد یہ ہے کہ حکمت اشیاء پر تحقیق میں اہل مغرب کو اولیت حاصل نہیں بلکہ اس پر بنیادی کام مسلمان نے کیا انہوں نے فرمایا:

حکمت اشیاء فرنگی زاد نیست — اصلِ او جز لذتِ ایجاد نیست
نیک اگر بینی مسلمان زادہ است — این گہر از دست ما افتادہ است
ایں پری از شیشۂ اسلافِ ماست — باز صیدش کن کہ او از قاف ماست
عصر نَو از ز جلوہ ھا آراستہ — از غبارِ پای ما برخاستہ

(اسرار خودی، ۷۴)

علامہ اقبال کی ان تعلیمات کا مقصد یہ ہے کہ مسلمان تسخیر فطرت کے عمل کے آگے بڑھیں اور ایک اعلی ترقی یافتہ آفاقی معاشرہ تشکیل کرنے کی کوشش کریں تا کہ دنیا میں امن قائم ہو، آدمی کا بحیثیت آدمی خواہ وہ کسی بھی مذہب، نسل، رنگ اور ملک سے تعلق رکھتا ہو، احترام کیا جائے۔ علامہ اقبال کے نزدیک ایسے ہی فلاحی معاشرے کی تشکیل سے اسلام کے حقیقی معنی روشن ہو سکتے ہیں اور یہی ہر مسلمان کا نصب العین ہونا چاہیے۔

بڑھے جا یہ کوہ گراں توڑ کر — طلسمِ زمان و مکاں توڑ کر
جہاں اور بھی ہیں ابھی بے نمود — کہ خالی نہیں ہے ضمیرِ وجود
ہر اک منتظر تیری یلغار کا — تری شوخی فکر و کردار کا

(اسرار خودی، ۷۴)

حوالے اور حواشی

1 عبدالسلام ندوی، اقبال کامل، اعظم گڑھ ۱۹۴۸ء، ص ۴

2 اردو دائرہ معارف اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی لاہور، جلد ۱۳، ص ۵۰۰

3 مقالات اقبال مرتبہ سے عبدالواحد معینی، لاہور، ۱۹۸۸ ایچ ص ۱۹۴

4 اقبال نامہ حصہ دوم، لاہور، ۱۹۵۱ء، ص ۴۵ بنام اکبر الہ آبادی

5 Nicholson, R.A., The Secrets of the Self, Lahroe, 1977. Introduction, pp. 19-25

6 محمد طاہر فاروقی، سیرت اقبال، لاہور، ۱۹۶۶ء، ص ۳۰۴۔۳۰۵

7 خود شگنم گردید و اجزاء آفرید (اسرار خودی)، کلیات اقبال فارسی، ص ۳۳

8 اقبال، تقریریں، تحریریں اور بیانات، لاہور، ۱۹۹۹ء، ص ۲۳۸

تصوف/فلسفہ

1 اقبال نامہ حصہ اول، لاہور، ص ۲۰۳

2 اقبال نامہ حصہ اول، ص ۴۶۵

3 اقبال تحریر، تقریریں اور بیانات، لاہور ۱۹۹۹ء، ص ۱۷۵

4 مکاتیب اقبال بنام نیاز الدین خان، ص ۱۔۲

5 اقبال نامہ، حصہ دوم، لاہور، ۱۹۵۱ء، ص ۴۵

6 مکاتیب اقبال بنام نیاز الدین خان

7 اسرار خودی، کلیات اقبال فارسی، ص ۴۹۔۵۰

8 تشکیل جدید الہیات اسلامیہ، لاہور، ۱۹۵۸ء، ص ۲

9 ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر، بزم اقبال، لاہور، ۱۹۹۴ء، ص ۱۸

10 تشکیل جدید الہیات اسلامیہ از دیباچہ، ص ۱۹۷

11 ایضاً، دیباچہ از ص ۵

12 شبلی نعمانی۔ الغزالی، کراچی، ۱۴۱۲ھ، ص ۹۷

13 تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، ص ۷

14 تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، ص ۱۷۳

15 ضرب کلیم، کلیات اردو، لاہور، ۱۹۹۹ء، ص ۵۳۰

اخلاق

1 تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، ص ۲۵۱

2 تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، ص ۲۵۲

3 رک۔ مظفر حسین، اساس فکر اقبال، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص ۳۱

4 ضرب کلیم، کلیات اردو، ۴۹۸

5 حرف اقبال، اسلام آباد، ص ۱۹۔۲۰

6 امتے بودی امم گردیدۂ

7 الخلق عیال اللہ

8 چیست ملت اے کہ گوئی لا الہ باہزاراں چشم بودن یک نگہ

9 حرف اقبال، ص ۱۸

10 اقبال نامہ، ص ۲۰۲

11 اقبال نامہ، جلد اول، لاہور، ص ۴۷

12 اقبال۔ تقریریں، تحریریں اور بیانات، لاہور، ۱۹۹۱ء، ص ۱۱۸۔۱۱۹

13 شہپر جبریل، لاہور، ۱۹۸۷ء، ص ۱۸۷

14 اسرار خودی، کلیات اقبال، فارسی، لاہور، ۱۹۸۹ء، ص ۱۰

علم سیاست

1 یوسف حسین خان، روح اقبال، دہلی، ۱۹۵۷ء، ص ۲۵۰

2 اقبال۔حرف اقبال، اسلام آباد، ۱۹۸۴ء، ص ۲۲

3 تشکیل جدید الہیات اسلامیہ، ص ۲۳۹۔۲۴۰

4 تشکیل جدید الہیات اسلامیہ، ص ۲۴

5 حرف اقبال، ص ۲۵

6 اقبال نامہ، جلد ۲، ص ۳۱۴

7 مقالات اقبال، ص ۱۲۸

8 مقالات اقبال، ص ۸۱

9 مقالات اقبال، لاہور، ۱۹۶۳ء، ص ۱۷۲

10 اقبال نامہ، جلد اول، ص ۴۶۸

11 ایضاً، ص ۴۷۲

12 گفتار اقبال، ص ۲۳۵

13 رفیق افضل، گفتار اقبال، لاہور، ص ۲۳۵

14 رفیق افضل، گفتار اقبال، لاہور، ص ۳۴۸

15 تقریریں، تحریریں اور بیانات، مرتبہ اقبال احمد صدیقی، لاہور، اقبال اکادمی پاکستان ۱۹۹۹ء، ص ۳۵۰

16 رفیق افضل، گفتار اقبال، ص ۱۹

17 اقبال نامہ جلد دوم، ص ۵۶

18 حرف اقبال، اسلام آباد، ۱۹۸۷ء، ص ۹۴

19 احمد سعید، اقبال اور قائداعظم، لاہور، ۱۹۷۷ء، ص ۹۴

علم فقہ

1 پیام مشرق، دیباچہ

2 تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، ص ۴۵

3 تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، ص ۲۴۲

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے سِرِّ آدم ہے ضمیر کن فکاں ہے زندگی (بانگ درا)

4 تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، ص ۲۶۰

5 تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، ص ۲۶۱

6 تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، ص ۱۴۶

7 تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، ص ۲۵۹

8 تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، ص ۲۶۷

9 تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، ص ۲۳۲

10 تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، ص ۲۷۴

11 تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، ص ۲۶۸

علم تاریخ

1 رفیق افضل۔ گفتار اقبال، لاہور، ۱۹۶۹ء، ص ۱۵۳۔۱۵۴

2 تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، ص ۲۱۲

3 رموز بے خودی، کلیات فارسی، ص ۱۵۶

4 تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، ص ۲۱۳۔۲۱۴

5 تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، ص ۲۱۳

6 گفتار اقبال، ادارہ تحقیقات پاکستان، دانشگاہ پنجاب، لاہور، ۱۹۶۹ء، ص ۱۰۴۔۱۰۵

7 مقالات اقبال، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۱۶۸

8 حرف اقبال، اسلام آباد، ۱۹۸۴ء، ص ۲۸

علم الاقتصاد

1 اقبال علم الاقتصاد، لاہور، ۱۹۹۱ء، ص ۳۱

2 اقبال، قومی زندگی، مقالات اقبال، ص ۸۶

3 محمد رفیق افضل، گفتار اقبال، لاہور، ۱۹۶۹ء، ص ۷

4 احمد سعید، اقبال اور قائداعظم، لاہور، ۱۹۷۷ء، ص ۱۰۶

علم شعر

1 اقبال نامہ، جلد اول، ص ۱۹۵۔۱۹۶

2 حضرت سید علی خامنہ ای، اقبال مشرق کا ستارہ درخشاں، لاہور، ۱۹۹۴ء، ص ۵

3 مقالات اقبال، ص ۲۶۰

4 حق اگر سوزے ندارد حکمت است شعر می گردد چو سوز از دل گرفت (پیام مشرق)

5 محمد رفیق افضل، گفتار اقبال، لاہور، ۱۹۶۹ء، ص ۲۵۰۔۲۵۱

6 کلیات اقبال، اردو، مطبوعہ نیشنل فاؤنڈیشن، لاہور، ۱۹۹۹ء ص ۱۰۔۱۲

علوم دانشی

1 اقبال، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، لاہور، ۱۹۵۸، دیباچہ

2 تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، ص ۱

3 تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، ص ۱۹۳

4 تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، ص ۱۳

5 تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، ص ۷

6 مقالات اقبال، ص ۲۳۴

7 مقالات اقبال، ص ۲۳۵

8 اقبال نامہ جلد دوم، لاہور، ۱۹۵۱ء، ص ۲۳۱

9 مکاتیب اقبال، جلد دوم، دہلی، ۱۹۹۱ء، ص ۲۳۶

10 اقبال، مقالات اقبال، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۲۸۱

11 اقبال، انوار اقبال، کراچی، ۱۹۶۷ء، ص ۲۵۸

12 Briffault Robert, The Making of Humanity. Lahore, 1980, pp. 188-189, 202-206

13 اردو دائرہ معارف اسلامیہ، دانشگاہ پنجاب، جلد ۱۳، ص ۴۹۲

14 تھامس آرنلڈ۔ میراث اسلام، لاہو، ۱۹۶۰ء، ص ۴۴۹، نیز دیکھئے تاریخ فرھنگ ایران از دکتر عیسیٰ صدیقی، تہران، ص ۴۲۹

15 فواد سیزگین۔ تاریخ علوم میں تہذیب اسلامی کا مقامی، ترجمہ خورشید رضوان، اسلام آباد، ۱۹۹۴ء، ص ۲۴ مزید دیکھئے:

Philip, K. Hitti, History of the Arabs. Tenth edition, 1992, pp. 365-370

16 آرنلڈ۔ میراث اسلام لاہور، ۱۹۶۰ء، ص ۴۶۶۔۴۶۸

17 عیسیٰ صدیق دکتر، تاریخ فرہنگ ایران، ص ۴۳۲

18 آرنلڈ۔ میراث اسلام لاہور، ص ۴۶۴

19 آرنلڈ۔ میراث اسلام لاہور، ص ۴۶۴

20 خدمات، ایران بہ فرہنگ جہان، تہران، ص ۴۲۴

علامہ محمد اقبال

مکتبوں میں کہیں رعنائی افکار بھی ہے؟
خانقاہوں میں کہیں لذتِ اسرار بھی ہے؟
منزلِ راہرواں دور بھی دشوار بھی ہے
کوئی اس قافلے میں قافلہ سالار بھی ہے؟
بڑھ کے خیبر سے ہے یہ معرکہ دین و وطن
اس زمانے میں کوئی حیدر کرّار بھی ہے؟
علم کی حد سے پرے، بندہ مومن کے لئے
لذتِ شوق بھی ہے، نعمت دیدرا بھی ہے
پیرِ میخانہ یہ کہتا ہے کہ ایوانِ فرنگ
سُست بنیاد بھی ہے، آئنہ دیوار بھی ہے!

(بال جبریل)